فروری ۹۸۹

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

★ تذکرہ وتبصرہ

مدیر تکبیر کی جارحانہ وسوسہ اندازیوں کے ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد کی توضیحات

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

سیمنٹ تعمیر کے لیے
اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا
کیک کے لیے میدہ

آج تک پاکستان میں ہونے والی ہر قسم کی تعمیر کے ۹۰ فی صد سے زائد میں سیمنٹ استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ سیمنٹ کے اعلیٰ معیار پر لوگوں کا مکمل اعتماد ہے اچھی تعمیر اور سیمنٹ لازم و ملزوم ہیں

انتخاب مبارک ہو

سیمنٹ مینوفیکچررز ایسوسی ایشن آف پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۳۸
شمارہ: ۲
جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ
فروری ۱۹۸۹ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/-
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove I L 60516
Tel : 312 969 6755

c/o Mr. Rashid A. Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel : 313 977 8081

CANADA US $ 12/-
c/o Mr. Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel : 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/-
c/o Mr. Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlesex EN 34 RP
Tel : 01 805 8732

MID-EAST DR 25/-
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

INDIA US $ 6/-
c/o Mr. Hyder M. D. Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel : 42127

K S A SR 25/-
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/-
c/o Mr. M.A. Habib
CC 720 Saudia P.O. Box 167
Jeddah 21231
Tel : 651 3140

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore.

ادارۂ تحریر
اقتدار احمد
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

تذکرہ وتبصرہ ——— ۳

مدیر تکبیر کی جارحانہ وسوسہ اندازیوں کے ضمن میں امیر تنظیم اسلامی کی توضیحات

الہدیٰ (نشست ۵۷) ——— ۱۱

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول۔ سورۃ الحجرات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیّت داعیٔ انقلاب (۲) ——— ۲۱

امیر تنظیم اسلامی کا ایک فکر انگیز خطاب

مرتب: (شیخ) جمیل الرحمٰن

قافلۂ انقلابِ اسلامی منزل بمنزل ——— ۴۳

الاخوان المسلمون ——— پس منظر اور داعیٔ تحریک

قاضی ظفر الحق

جہادِ افغانستان ——— ۵۳

کوئٹہ محاذ پر چھ دن

خواجہ عبد الباری

مکالمہ ——— ۶۵

دسمبر ۸۸ء میں منعقدہ محاضراتِ قرآنی (کراچی) میں امیر تنظیم اسلامی اور مدیر تکبیر کے مابین "گفت وگو" جسے کیسٹ سے مِن وعَن نقل کیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

ہفت روزہ "تکبیر" کراچی کی ۱۲ر جنوری ۸۹ء کی اشاعت میں "پاسباں مل گئے کعبے سے صنم خانے کو!" کے عنوان کے تحت ایک مفصل تحریر کی صورت میں راقم الحروف کی کردار کشی کی وہ کوشش اپنے عروج کو پہنچ گئی جو اس سے قبل کی چند اشاعتوں میں تدریج کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔

مدیر "تکبیر" نے اپنی اس کاوش کا آغاز ۱۵ر دسمبر کے شمارے میں نہایت "معصومانہ" انداز میں کیا تھا۔ چنانچہ "قرآن و سنت کی روشنی میں عورت کی سربراہی" کے موضوع پر اپنی ایک طویل تحریر کے اول و آخر میں دوبار راقم کا تذکرہ کسی قدر تائیدی انداز میں کرتے ہوئے قارئین کے ذہن میں ایک مبہم سے سوال کے حوالے سے ایک کانٹا بھی چبھا دیا تھا..... یعنی اگرچہ اول و آخر دو مرتبہ یہ صراحت کر دی گئی کہ "بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اسے دوسرے منکرات کی موجودگی میں مثلاً سود وغیرہ کی طرح گوارا تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے حق میں فتویٰ نہیں دیا جاسکتا" ..... اور "حقیقت یہ ہے کہ بے نظیر کی سربراہی آئین کی رو سے بالفعل (DEFACTO) تو تسلیم کی جاسکتی ہے بلکہ بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اسے ایک منکر کے طور پر گوارا کیا جاسکتا ہے لیکن شریعت کی رو سے اسے قانونی (DEJURE) تسلیم نہیں کیا جاسکتا" ..... لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فرما کر قارئین کے ذہن میں بطرز ایہام ایک وسوسہ بھی پیدا کر دیا کہ..... "ڈاکٹر صاحب نے بھی یہ نہیں بتایا کہ منکرات کے معاملے میں ایک مسلمان کا رویہ بس "گوارا" کر لینے پر آکر رک جاتا ہے یا اس کے سلسلے میں اس کی ذمہ داریاں کچھ اور بھی ہیں....."

راقم الحروف دو روزناموں یعنی "نوائے وقت" اور "جنگ" کی سرخیاں تو التزاماً دیکھتا ہے (اس لئے کہ خبروں کے ضمن میں نہ ریڈیو سننے کا وقت دستیاب ہے نہ ٹی وی دیکھنے کا موقع!) ہفت روزوں اور ماہناموں کے دیکھنے کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی ہے اور وہ بھی کسی رفیق کے کسی خاص مضمون کی جانب متوجہ کرنے پر' ..... "تکبیر" کا متذکرہ بالا "وسوسہ" راقم کے علم میں لایا گیا تو شدید تعجب ہوا۔ اس لئے کہ انکارِ منکر اور ابطالِ باطل کے انقلابی طریق کار پر راقم نے بے شمار تقریریں کی ہیں' پھر اس موضوع پر راقم کی کتاب "منہج انقلاب نبویؐ" عرصہ ہوا منصّہ شہود پر آ چکی ہے۔ ایک ذمہ دار صحافی کی حیثیت سے صلاح الدین صاحب کے بارے میں یہ بمشکل ہی باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس موضوع پر میرے خیالات سے واقف نہ ہوں۔ مزید برآں لگ بھگ تین سال قبل ۱۴ر تا ۲۰ر فروری ۸۶ء کے "تکبیر" میں میرا ایک مفصل انٹرویو نہایت آب و تاب سے شائع ہو چکا ہے جو خود صلاح الدین صاحب نے اپنے ایک معاون کی معیت میں مجھ سے لیا تھا۔ اس میں بھی اس موضوع پر مفصل گفتگو شامل تھی..... اور اس سے بھی بڑھ کر ٹی وی کے "روبرو" پروگرام میں اس موضوع پر مفصل سوال جواب مدیر "تکبیر" سے علیٰ رؤوس الاشہاد ہو چکا تھا.....!!..... پھر اس تجاہل عارفانہ کا سبب؟ ع "اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!" ..... تاہم راقم نے اس ضمن میں کچھ تو حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے اسے قلم کی "رواروی" پر محمول کیا! اور کچھ اس بات کا الاؤنس بھی دیا کہ برادرم اقتدار احمد نے "ندا" میں نومبر ۸۸ء کے انتخابات کی مہم میں "تکبیر" کے کردار پر صراحت کے ساتھ جو تنقید کی تھی شاید یہ اس کا "عوض معاوضہ" ہے!۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام سالانہ محاضراتِ قرآنی کا ریگولر پروگرام مارچ ۸۸ء میں لاہور میں منعقد ہو چکا تھا۔ اور اس کا انداز معمول کے مطابق ہی تھا۔ یعنی پورے چار روزہ پروگرام کا ایک جامع عنوان "اسلام کا نظام حیات" تھا..... اور ہر روز متعدد اصحابِ علم و اربابِ دانش اس کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے سیاسی نظام کے موضوع پر ایک نہایت خوبصورت تقریر جناب صلاح الدین صاحب نے بھی سورۂ نساء کی آیات ۵۸' ۵۹ کے حوالے سے کی تھی..... انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام جو اضافی پروگرام "محاضرات قرآنی" ہی کے عنوان سے کراچی کے

ریکس آڈیٹوریم میں ۱۷ر تا ۲۱ر دسمبر ۸۸ء منعقد ہوا وہ اصلاً "شام الھدیٰ کراچی" کی ایک خصوصی صورت تھی جس میں اسلام کے نظام حیات کے مختلف پہلوؤں پر مفصل خطاب راقم الحروف کو کرنا تھا اور بعض اہل علم اور دانشور حضرات کو صرف بحیثیت "مستفسر" اس خیال سے دعوت دی گئی تھی کہ ان کی نشاندہی پر ممکنہ اغلاط کی تصحیح بھی ہو سکے اور گفتگو میں جو خلا باقی رہ جائیں وہ بھی پر کئے جا سکیں۔ اصحابِ علم و دانش کے لئے اس حیثیت کو قبول کرتے ہوئے اس پروگرام میں شرکت پر آمادگی یقیناً ذاتی ایثار کی متقاضی تھی۔ چنانچہ بعض حضرات کی صراحت کے ساتھ معذرت ہمارے لئے بالکل قابلِ فہم تھی..... اور خاص طور پر "ندا" کی متذکرہ بالا تنقید کے پیش نظر صلاح الدین صاحب کے بارے میں تو مجھے قطعاً امید نہ تھی کہ وہ اس پروگرام میں شرکت گوارا فرمائیں گے۔ لیکن کراچی پہنچنے پر جب رفیق مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب سے معلوم ہوا کہ انہوں نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہے تو مجھے کسی قدر تعجب تو ہوا، لیکن میں نے اسے ان کی عالی حوصلگی اور وسعتِ ظرف ہی پر محمول کیا۔ اس لئے کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ کس ارادے اور نیت سے شرکت فرما رہے ہیں۔

(اور اب بھی اگرچہ فنی طور پر تو ان کی نیت پر شبہ سوءِ ظن ہی شمار ہو گا۔ لیکن اس کے قوی شواہد اس تحریر میں موجود ہیں جو "تکبیر" کے اس شمارے میں شائع ہوئی جس پر ۲۹ر دسمبر کی تاریخ درج ہے۔ اس لئے کہ جب ۲۰ر دسمبر کو وہ محاضرات قرآنی میں شرکت کے لئے تشریف لائے تو اغلباً وہ تحریر ان کے قلم سے نکل چکی تھی ورنہ یقیناً اس کا پورا ہیولیٰ تو ان کے ذہن میں تیار ہو ہی چکا تھا۔ اس تحریر کے بارے میں گفتگو بعد میں ہو گی۔ اس لئے کہ خود راقم کی نظر سے وہ بہت بعد میں گزری!۔)

۲۰ر دسمبر کی شام کو ریکس آڈیٹوریم میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کا استقبال احسانمندی کے جذبات کے ساتھ کیا۔ اور اپنی تقریر کے دوران میرے یہ جذبات مزید گہرے ہوتے چلے گئے۔ اس لئے کہ مجھے خوب اندازہ ہے کہ ایک ایسے دانشور کے لئے جو خود صاحب قلم بھی ہو اور صاحبِ زبان و بیان بھی کسی دوسرے مقرر کی سوا دو گھنٹے کی تقریر سننا آسان کام نہیں ہے! اور اس کے لئے بڑے صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے!..... لیکن تقریر کے بعد سوال جواب کے سلسلے میں جب میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ باضابطہ "الجھنے" کی کوشش کر رہے ہیں۔ تو ایک بار تو میں نے یہ عرض کیا کہ "یہاں بحث کی گنجائش نہیں ہے، اور اس اجتماع کا "FORMAT" یہ نہیں ہے"..... اور ایک مرحلے پر یہ کہا کہ "اس مسئلے میں میں اس سے

زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس لئے بھی کہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں اور اس لئے بھی کہ اس کا آج کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے" ۔اس حد تک تو معاملہ از بس غنیمت ہی تھا لیکن ان کے دو سوالوں پر میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے میری تقریر سنی ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ میری صراحتوں کے بالکل برعکس مؤقف میری طرف منسوب کر رہے تھے۔ اس پر ایک بار تو میں نے عرض کیا کہ شاید آپ نے میری بات پر توجہ نہیں کی۔ لیکن دوسری بات پر مجھے حیرت اور تعجب کے ساتھ یہ کہنا پڑا کہ "معاملہ کیا ہے؟ آپ نے تو شاید میری تقریر سنی ہی نہیں!" ..... اس پر حاضرین کی جانب سے ایک بڑا بلند آہنگ قہقہہ پڑا' جس پر فطری طور پر صلاح الدین صاحب بھی خجل ہوئے اور مجھے بھی دلی افسوس ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس قہقہے کا اصل سبب یہ تھا کہ میری تقریر کے دوران صلاح الدین صاحب باقاعدہ سوتے رہے تھے' اور یہ بات میرے تو علم میں نہیں تھی۔ کیونکہ وہ میری بائیں جانب کسی قدر پیچھے کی طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ہال میں اگلی قطاروں میں بیٹھے ہوئے سامعین وناظرین نے انہیں سوتے ہوئے دیکھا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی میں نے کہا کہ شاید آپ نے میری بات سنی ہی نہیں تو ان حضرات کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اور یہ بات صلاح الدین صاحب کی خفت کا سبب بن گئی!۔ اسی طرح ایک مرحلے پر جب کہ وہ عورت کی سربراہی کے مسئلے پر زیادہ ہی الجھ رہے تھے میں نے بات کو ختم کرنے کے لئے "اسلامی جمہوری اتحاد" کی نمائندہ بیگم عفیفہ ممدوٹ صاحبہ کا ذکر کر دیا جس پر وہ بالکل بتاشے کی طرح بیٹھ گئے..... (اور خدا گواہ ہے مجھے اس پر بھی کوئی خوشی نہیں بلکہ افسوس ہی ہوا تھا)۔

اجتماع کے اختتام پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ساتھ اپنا ۱۵ر دسمبر والا مضمون بھی کتابچے کی صورت میں لے کر آئے تھے جسے انہوں نے وہاں چیدہ چیدہ حضرات کو تقسیم بھی کیا۔ مزید برآں یہ کہ وہ اجتماع گاہ سے کسی قدر دل گرفتہ بلکہ بھنّائے ہوئے رخصت ہوئے تھے۔ اس پر میں نے اپنے دل میں بھی یہ طے کر لیا اور بعض احباب سے اپنے اس ارادہ کا تذکرہ بھی کر دیا کہ میں جب جنوری کے اوائل میں عمرہ کے لئے حجاز جاتے ہوئے کراچی آؤں گا تو ان سے ملاقات کر کے ان کی دلجوئی کی کوشش کروں گا۔

لاہور واپسی پر "تکبیر" کی اشاعت بابت ۲۹ر دسمبر والا مضمون بعنوان "اسلام میں عورت کا مقام۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی نگاہ میں!" جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے علم میں آیا۔ اس

مضمون میں ماہنامہ "میثاق" کی اس موضوع پر ایک خصوصی اشاعت (بابت مئی ۱۹۸۲ء) میں شائع شدہ تحریروں اور میری ۲۳ر مارچ اور ۲۶ر مارچ (۱۹۸۳ء) کی دو تقریروں کے مفصل اقتباسات دے کر تان اس "استفہامِ استعجابی" یا "استفہامِ انکاری" پر توڑی گئی کہ:-

"ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ٹوٹی وی پر خاتون نیوز ریڈر بھی دیکھنے کے روادار نہیں، تو پھر اسے سربراہِ حکومت دیکھنا کیسے گوارا کریں گے؟ آخر اس استثناء اور رخصت کی کوئی شرعی توجیہہ؟....."

اور اس کے بعد پروپیگنڈے کی "معروف" ٹیکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے میرے "نیازمندوں کے ذہنوں" میں وسوسہ اندازی کی بھرپور کوشش کی گئی کہ:-

"یہ ایک ایسا سوال ہے جو ان کے نیازمندوں کے ذہنوں میں ان کے تازہ مؤقف کی وجہ سے ہلچل مچائے ہوئے ہے!....."

اس پر اولین اور شدید ترین حیرت تو اس اعتبار سے ہوئی کہ ۱۵ر اور ۲۹ر دسمبر کے مابین میرے مؤقف میں وہ کونسی تبدیلی آئی ہے جس پر "تکبیر" نے اس صلیبی جنگ (CRUSADE) کا آغاز کر دیا ہے؟۔ میرا مؤقف جو پہلے تھا وہی اب بھی ہے میں نے جس چیز کو پہلے از روئے شرع و دین "منکر" قرار دیا تھا، اسے اب بھی منکر ہی قرار دے رہا ہوں بلکہ زیادہ شدّومد کے ساتھ قرار دے رہا ہوں، پھر یہ تبدیلی کیوں کہ پہلے حوالہ تائیدی انداز میں تھا اور اب اس پر چاندماری شروع کر دی گئی ہے!۔

دوسرا سوالیہ نشان ذہن کے سامنے اس مسئلے پر آن کھڑا ہوا کہ میری ۸۳۔ ۱۹۸۲ء کی تقاریر اب ہی کیوں یاد آئیں۔ اس وقت ان کی جانب التفات کیوں نہ ہوا جب پورے ملک میں اس مسئلے پر شور برپا تھا، اور میری تائید و تحسین اور مخالفت و مذمت دونوں زوروں پر تھیں..... لیکن مرحوم ضیاء الحق صاحب "اتھارٹی میں ہوں، ڈاکٹر اسرار نہیں!" کے نعرے بھی لگا رہے تھے اور عورتوں اور مردوں کے "شانہ بشانہ" چلنے کی تائید ہی نہیں باضابطہ "تبلیغ" فرما رہے تھے، بلکہ انہوں نے اپنے قول و فعل میں یکسانیت کے مظاہرے کے لئے ایک جانب ہوسٹن (امریکہ) میں ایک سوال کے جواب میں اپنے طرزِ عمل کو اسلام کی عملی تفسیر کے طور پر پیش کیا تھا..... اور دوسری جانب منتخب اداروں میں خواتین کی نشستیں ایکدم کئی گنا بڑھا دی تھیں؟..... ؟؟ اس وقت تو میری تحریروں اور تقریروں کی تو بساط ہی کیا ہے، قرآن حکیم کی

وہ آیات' اور وہ احادیث نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام!) بھی لائقِ التفات نہ ٹھہری تھیں جو آج "عورت کی سربراہی" نامی کتابچے کی زینت ہیں!!۔

(۔ "خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے" اور "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!" کا اطلاق..... اگر ضرور کرنا ہی ہے..... تو الفاظِ قرآنی۔ "وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ" کے مصداق اس معاملے پر کیجئے!۔)

بہرحال..... متذکرہ بالا دونوں باتوں پر تعجب اور تحیر تو بہت ہوا' لیکن اللہ گواہ ہے کہ کوئی سوءِ ظن مدیر "تکبیر" کی ذات سے اس وقت بھی پیدا نہیں ہوا۔ اور اگرچہ ذہن یہ تسلیم کرنے سے انکاری تھا کہ ان کی نگاہ سے میری وہ دو تقریریں نہیں گزری ہوں گی جو میں نے ۲ر اور ۹ر دسمبر کے اجتماعاتِ جمعہ میں کی تھیں' اور جو "ندا" کی ان اشاعتوں میں شائع ہو چکی تھیں جن پر ۲۰ر اور ۲۷ر دسمبر کی تاریخیں درج تھیں۔ بالخصوص ۲ر دسمبر والی تقریر جس میں میں نے ایک خاتون کے وزیراعظم نامزد کئے جانے پر شدید رنج و غم اور دلی صدمے کا اظہار کیا تھا..... تاہم میں نے اپنے دل کو یہی بہلاوا دیا کہ شاید میرا پورا مؤقف ان کے سامنے نہیں آیا۔ اور جب یہ تقاریر ان کی نظروں سے گزریں گی تو وہ اپنی "وسوسہ اندازی" سے رجوع کر لیں گے! (یہی وجہ ہے کہ میں نے ادارۂ "میثاق" کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان دونوں تقاریر کو "میثاق" میں بھی شائع کر دے۔ چنانچہ اس کی جنوری کی اشاعت میں وہ دوبارہ شائع کر دی گئیں!)

واضح رہے کہ "اسلام میں خواتین کے مقام" اور اسلام میں ستر و حجاب کے احکام' اور مخلوط معاشرے کا بحیثیت مجموعی اسلام کی روح اور اس کے مزاج کے مخالف ہونے کے ضمن میں میرے مؤقف اور رائے کے ضمن میں ۸۳۔ ۱۹۸۲ء اور ۸۹۔ ۱۹۸۸ء کے مابین سرِ مو فرق نہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس معاملے میں میرے رویئے میں بھی بال برابر فرق واقع نہیں ہوا۔ اس لئے کہ ۸۲ء میں بھی میں نے نہ تو از خود کسی مہم کے طور پر اس مسئلے کو اٹھایا تھا اور نہ ہی اس پر کوئی سیاسی تحریک چلائی تھی۔ بلکہ یہ مسئلہ اٹھا بھی اس طرح تھا کہ ارشاد احمد حقانی صاحب نے ایک گفتگو کے آخر میں اٹھتے اٹھتے بلکہ چلتے چلتے بعض سوالات کئے اور جب ان کے بے تکلف اور بے ساختہ جوابات شائع ہوئے تو جدید تعلیم یافتہ مغرب زدہ خواتین نے شور و غوغا برپا کر دیا..... ان کے اس خلافِ شریعت شور و غوغا پر جو عوامی ردِ عمل بالخصوص بلا لحاظ مسلک و مشرب جملہ مذہبی حلقوں کی جانب سے ظاہر ہوا' اس سے فی الواقع ایسی صورت بن گئی

تھی کہ اگر میں کوئی "سیاسی حیوان" ہوتا تو صدر ضیاء الحق صاحب کی حکومت کے خلاف ایک سیاسی تحریک شروع کر دیتا..... لیکن اس کام کو میں نے نہ اُس وقت ملک و ملت اور دین و مذہب کے لئے مفید سمجھا تھا، نہ آج سمجھتا ہوں۔

اس ضمن میں مناسب ہے کہ مرحوم صدر ضیاء الحق کے ساتھ اپنی اس گفتگو کا حوالہ تحریری طور پر بھی دیدوں، جس کا ذکر میں نے اپنی بہت سی تقریروں میں کیا ہے جو کیسٹوں میں محفوظ ہیں۔

یہ ۵ر مئی ۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے کہ جب میں صدر ضیاء الحق صاحب کی شوریٰ سے استعفاء دینے ان کی خدمت میں گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں حاضر ہوا تو اثنائے گفتگو میں انہوں نے کسی اخبار کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "اس میں آپ کے بارے میں جو مضمون چھپا ہے کیا آپ نے پڑھا ہے؟" اس پر جب میں نے عرض کیا کہ وہ مضمون تو میری نظر سے نہیں گزرا لیکن آپ بتا دیجئے کہ اس میں کیا لکھا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ "صاحبِ مضمون نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ڈاکٹر اسرار بہت باصلاحیت شخص ہے اور ملک و قوم کی بہت مفید خدمت سرانجام دے سکتا ہے بشرطیکہ صرف ایک خواتین کے معاملے میں اپنے مؤقف میں لچک پیدا کر لے!" میں نے ان کا اشارہ پا کر ان کی خدمت میں تین باتیں اس وقت کے گورنر پنجاب جنرل غلام جیلانی صاحب کی موجودگی میں ان سے کہیں ؎

ایک یہ کہ میری رائے صرف دلیل سے بدلی جا سکتی ہے۔ اگر میں اپنے دینی مؤقف کو وقتی مصلحتوں کے تابع کر دوں تو میری معنوی موت واقع ہو جائے گی۔

دوسرے یہ کہ آپ خود غور کریں کہ آپ یہ کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لئے ہوئے ہیں کہ آپ نے شرعی عدالت قائم کی ہے۔ لیکن اس کے ہاتھ سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے نافذ کردہ عائلی قوانین تک کے ضمن میں باندھ دیئے ہیں۔ شرعی عدالت کے جج آپ کا ذاتی انتخاب ہیں..... اور یقیناً آپ کو ان کے دین و شریعت کے فہم پر بھی اعتماد ہے اور ان کے کردار پر بھی..... تو کیوں نہیں آپ ان کے ہاتھ کھول دیتے کہ وہ شریعت کے مطابق فیصلہ کر دیں کہ ان عائلی قوانین کی کوئی شق خلافِ اسلام ہے یا نہیں اور ہے تو کون سی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ وہ کریں جو میں کہتا ہوں۔ میرا مطالبہ صرف یہ ہے کہ آپ شرعی عدالت پر سے پابندی ہٹا لیں..... پھر وہاں غلام احمد پرویز صاحب پر بھی (موصوف اس وقت تک بقید حیات تھے) کوئی قدغن نہیں ہے۔ جائیں اور اپنے تصنیف کردہ عائلی قوانین کا مطابقِ شریعت ہونا

ثابت کر دیں..... (افسوس کہ میری اس بات کا جو جواب مرحوم نے دیا وہ اس قدر بودا اور مضحکہ خیز تھا کہ اب ان کے انتقال کے بعد میں اسے نقل بھی نہیں کرنا چاہتا!)

تیسری بات، جس کے لئے یہ ساری تفصیل سپرد قلم کی گئی ہے، یہ تھی کہ اس وقت میں اس پوزیشن میں ہوں کہ اس مسئلے پر آپ کے خلاف ایک تحریک برپا کر دوں۔ لیکن یہ میں اس لئے نہیں کر رہا کہ میرے پاس کوئی مضبوط جماعت موجود نہیں ہے جو اسے کنٹرول کر سکے اور حدود و قیود کا پابند رکھ سکے..... لہٰذا اندیشہ ہے کہ اسے دوسری سیاسی قوتیں اپنی مطلب براری کا ذریعہ بنالیں گی!۔

بعینہٖ یہی مؤقف میرا آج بھی ہے کہ اگر اس وقت بھی عورت کی سربراہیٔ حکومت کے خلاف عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر کوئی ایجی ٹیشن شروع کر دیا گیا تو بحالاتِ موجودہ نہ صرف یہ کہ وہ کسی نہ کسی سیاسی کھیل کا ضمیمہ بن جائے گا..... بلکہ عین ممکن ہے کہ اسے ملک و قوم کے دشمن اپنے مذموم مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنالیں۔

باز آمدم بر سرِ مطلب..... "تکبیر" کے ۲۹ر دسمبر کے شمارے والے مضمون پر دل اور دماغ کے مابین کشمکش اور کشاکش تو بہت رہی لیکن اس حسن ظن کی بنا پر جو اس وقت تک راقم کو مدیر "تکبیر" کی ذات سے تھا..... میں اپنے اس فیصلے پر قائم رہا کہ ۳ر تا ۵ر جنوری اپنے کراچی کے قیام کے دوران کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر ان سے ضرور ملوں گا اور شکوک و شبہات کے ازالے کی کوشش کروں گا!

لیکن افسوس کہ جب ۳ر جنوری کو کراچی پہنچا تو "تکبیر" کا وہ شمارہ شائع ہو چکا تھا جس پر ۵ر جنوری کی تاریخ درج تھی..... اور مجھے بتایا گیا کہ اس میں ایک نہایت تہدید آمیز اور اشتعال انگیز اعلان نمایاں طور پر شائع ہوا ہے کہ۔

> "محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! علامہ اقبال اور خود اپنے آپ پر رحم فرمایئے.....! کراچی میں محاضرات قرآنی کے پروگرام کے تحت "اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام" کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کے ارشادات کا جائزہ..... مدیر تکبیر محمد صلاح الدین کے قلم سے!"

اس پر میں نے اس خیال سے کہ اب ان سے ملاقات بزدلی اور فرار پر محمول کی جائے گی، ملاقات کا ارادہ ملتوی کر دیا کہ اب دیکھ ہی لیا جائے کہ وہ کیا کہتے ہیں!

(باقی صـ۷۲ پر)

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس ۱۲ / نشست ۵۷

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۴)

نحمدہٗ و نصلّی علٰی رسولہ الکریم .... امّابعد

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ؕ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ○ (الحجرات ۱۱-۱۲)

صدق اللّٰہ العظیم

"اے ایمان والو! تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہو سکتا ہے کہ وہ گروہ ان سے بہتر ہو۔ اور نہ ہی عورتیں دوسری

عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ہی تم اپنے آپ کو عیب لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کے لئے برے نام رکھو۔ ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی برا ہے۔ اور جو اس سے باز نہیں آئے گا تو (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) وہی ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! کثرت سے گمان کرنے سے بچو۔ اس لئے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ٹوہ لگایا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت کرے۔ کیا تم سے کوئی شخص اسے پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ پس یہ بات تو تمہیں انتہائی ناپسند ہے اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ توبہ کو قبول کرنے والا (اور) رحم فرمانے والا ہے"۔

محترم حاضرین اور معزز ناظرین..... یہ سورۃ الحجرات کی آیات نمبر گیارہ اور بارہ ہیں' جن کی آپ نے تلاوت اور ترجمہ سنا۔ اس درس کے بارے میں میں نے جو تمہیدی گفتگو کی تھی اس میں عرض کر دیا تھا کہ اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو اگر تین حصوں میں تقسیم کیا جائے تو پہلے اور آخری حصّے میں مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعی اور حیاتِ ملّی سے متعلق نہایت اہم اور اساسی و بنیادی باتیں زیر بحث آئی ہیں..... درمیانی حصے میں مسلمانوں کے مابین اتحاد و اتفاق اور محبت و مودّت کی فضا کو برقرار رکھنے کے لئے اور اختلاف و افتراق اور نفرت و عداوت کے سدّباب کے لئے چند احکام دیئے گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ دو حکم بڑے ہیں اور چھ ان دو کے مقابلے میں چھوٹے ہیں۔ میری اس بات سے کوئی غلط فہمی راہ نہ پائے اس لئے جان لیجئے کہ قرآن مجید کی کوئی بات چھوٹی نہیں ہے لیکن قرآن حکیم کی باتوں کے مابین ایک نسبت و تناسب ممکن ہے۔ چنانچہ آج ہم جن دو آیات کا مطالعہ کر رہے ہیں' ان میں وہ چھ احکام بصورتِ نواہی آ رہے ہیں۔

ان چھ احکام کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ مجلسی برائیاں ہیں جو ہمارے یہاں بہت عام ہیں اور انہیں عام طور پر حقیر اور بہت معمولی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی وجہ سے بسا اوقات باہم دل پھٹ جاتے ہیں' رشتۂ محبّت و مودّت منقطع ہو جاتا ہے اور نفرت و کدورت دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ اگر ہم امّت مسلمہ کو ایک فصیل سے تشبیہ دیں تو ظاہر بات ہے کہ فصیل اینٹوں سے بنی ہوتی ہے اور فصیل کے مضبوط ہونے میں دو چیزوں کو دخل ہے۔ ایک یہ کہ ہر اینٹ پختہ ہو اور دوسرے یہ کہ ان اینٹوں کو باہم جوڑنے والا مسالہ بھی خالص اور مضبوط

ہو۔ ان دونوں میں سے ایک چیز بھی کمزور اور غیر خالص ہو گی تو اس کا نتیجہ فصیل کی کمزوری نکلے گا۔ ہم نے قرآن کریم کی ان آیات پر بھی غور کیا جن میں نہایت تاکید کی گئی ہے اور زور دیا گیا ہے کہ امّتِ مسلمہ کے ہر ہر فرد کے سیرت و کردار کو پختہ کیا جائے۔ اور آج ہم ان آیات کا مطالعہ کر رہے ہیں جن میں مسلمانوں کے افراد و اشخاص کے مابین بھی، کنبوں اور خاندانوں کے مابین بھی اور قوموں اور قبیلوں کے مابین بھی جوڑنے والے مسالے کو مضبوط اور خالص رکھنے کے لئے جن چیزوں سے بچنا ضروری ہے، وہ ہمارے سامنے آتی ہیں۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ..... لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ..... اور وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ..... عام طور پر قرآن مجید میں جو احکام آتے ہیں وہ صرف مردوں سے خطاب کر کے ارشاد ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ احکام صرف مردوں ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ عربی گرامر کا یہ قاعدہ ہے کہ خطاب میں بر سبیلِ تغلیب کسی ایک چیز کا ذکر کر دینے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ دوسری چیز جو اس کے تابع ہے وہ بھی مخاطب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر احکام صیغۂ مذکّر میں دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس حکم کی خواتین کے لئے خاص طور پر تکرار آئی ہے۔ اس تکرار کی حکمت اور وجہ تھوڑے سے غور سے سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ مجلسی خرابی مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ مردوں کے سامنے زندگی کے بہت سے اہم تر مسائل اور تلخ تر حقیقتیں رہتی ہیں اور اُن میں ان کی مشغولیت رہتی ہے، جبکہ خواتین کا دائرۂ عمل چونکہ بالعموم محدود رہتا ہے لہٰذا یہ باتیں ان میں زیادہ رواج پا جاتی ہیں۔ کسی کے لباس پر کوئی فقرہ چست کر دیا۔ کسی کی شکل و صورت کے بارے میں کوئی استہزائی انداز کا تبصرہ کر دیا۔ کسی کا رہن سہن اور چلن اگر فیشن کے مطابق نہیں ہے تو اس کا تمسخر اڑا دیا گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہم قرار دے کر ان پر اس طرح کی **پھبتیاں** چست کر دینا، ان پر استہزائی اور تمسخر کے انداز میں تبصرے کر دینا عام طور پر عورتوں کی مجلسی زندگی میں یہ برائی زیادہ پائی جاتی ہے لہٰذا اُس کا یہاں خاص طور پر علیٰحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ خرابی مردوں میں نہیں ہے۔ مردوں میں بھی یہ برائیاں موجود ہیں، چنانچہ پہلے انہیں خطاب کیا گیا اور اس کے بعد اسے خواتین کے لئے دوہرا دیا گیا۔

اب اگر آپ مزید غور کریں گے تو واضح ہو گا کہ واقعہ یہ ہے کہ باہم دوستوں میں بھی ایک دوسرے کا تمسخر و استہزا بسا اوقات رنجش کا سبب بن جاتا ہے اور دوستیاں ٹوٹ جاتی

ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مذاق کسی دوست سے دس مرتبہ کیا گیا اور وہ برداشت کر گیا' لیکن کسی وقت اس کا موڈ آف ہے تو ایسے لمحے میں ہو سکتا ہے کہ وہی مذاق اس کی برداشت سے باہر ہو جائے اور وہ پھٹ پڑے اور یہ پھٹ پڑنا ہو سکتا ہے کہ دیرینہ سے دیرینہ دوستی کے رشتے کو منقطع کرنے کا باعث بن جائے۔ یہ معاملہ خالص افراد کی سطح پر بھی ہو سکتا ہے اور گروہوں' خاندانوں' کنبوں اور قبیلوں کی سطح پر بھی ہو سکتا ہے۔ پس پہلا حکم یہ دیا گیا کہ تمسخر اور استہزاء سے باز رہو۔ اب دیکھئے کہ اس میں اپیل کا ایک بڑا مؤثر انداز بھی موجود ہے۔ اپیل کا اس سے زیادہ مؤثر اسلوب ممکن نہیں ہے۔ مردوں کے لئے فرمایا۔ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ۔ اور عورتوں کے لئے فرمایا۔ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ۔ تم جس کی ظاہری کمزوری یا عیب کو دیکھ کر مذاق اڑا رہے ہو' اس پر فقرے چست کر رہے ہو' اس شخص کے متعلق تمہیں کیا معلوم کہ اس کے دل میں اللہ کی کتنی محبّت ہو' اس کے دل میں محبتِ رسولؐ کا کتنا بڑا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو اور اللہ کو تو قدر ان چیزوں کی ہے۔ جیسے ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی اَجْسَادِکُمْ وَلَا اِلٰی صُوَرِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَ اَعْمَالِکُمْ۔ "اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ اللہ کی نگاہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال پر ہے"۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ سیرت و کردار اور اللہ اور رسولؐ کی محبت و اطاعت اور فرمانبرداری میں تم سے کہیں آگے ہو' اللہ کے یہاں اس کا رتبہ بہت بلند ہو..... حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو صورت و شکل تھی' اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ پھر انؓ کا حال یہ تھا کہ عربی کے بعض تلفظ صحیح ادا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ انؓ سے شین بالکل ادا نہیں ہوتا تھا۔ اذان میں وہ اسھدان لاالٰہ الّا اللّٰہ اسھدانّ محمّدا رّسولُ اللّٰہ کہا کرتے لیکن انؓ کے دل میں اللہ پر' آخرت پر اور رسالت پر جو ایمان تھا اور انؓ کے ریشے ریشے میں اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو شدید محبت رچی بسی تھی اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ امیر المؤمنین' خلیفۃ المسلمین انؓ سے سیدنا بلالؓ کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ تو پہلی بات یہ آئی اور اس کی ترغیب میں بہت ہی مؤثر اپیل سامنے آئی۔

دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ خود اپنے آپ کی عیب چینی نہ کیا کرو۔ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ۔ جو تنگ نظر رکھنے والا انسان ہو گا' جس کا اپنا ظرف چھوٹا ہو گا اس میں یہ بات نظر

آئے گی کہ وہ دوسروں کے عیب تلاش کرے گا' عیب چینی کرے گا' عیب جوئی کرے گا' ان کی کسی برائی کو ان کے منہ پر دے مارے گا' ان کی توہین کرنے کو اپنا وطیرہ بنالے گا۔ اب یہاں دیکھئے کہ کیسا پر تاثیر اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے۔ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ تم اگر کسی مسلمان کی عیب جوئی کر رہے ہو' اس پر عیب لگا رہے ہو' اس کے عیب ظاہر کر رہے ہو تو وہ تمہارا اپنا مسلمان بھائی ہے۔ گویا اس طرح تم نے خود اپنے آپ کو عیب لگایا ہے۔ اب اس سے زیادہ مؤثر اپیل کا انداز اور دلنشین پیرایہ ممکن نہیں ہے۔ جیسے ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اپنے ماں باپ کو گالیاں مت دیا کرو"۔ اس پر کسی نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ "کون شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے گا!" حضورؐ نے جواباً ارشاد فرمایا "اگر تم کسی کے ماں باپ کو گالی دو گے اور وہ پلٹ کر تمہارے ماں باپ کو گالی دے گا تو درحقیقت یہ تم نے خود اپنے والدین کو گالی دی"۔ اگر یہ بات دل کی گہرائی میں اتر جائے تو وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کی بلاغت و حکمت واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔

تیسرا حکم آیا وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ ایک دوسرے کے برے نام' چڑانے والے نام' تحقیر آمیز نام رکھ کر ان ناموں سے کسی کو مت پکارا کرو۔ ظاہر بات ہے کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اور اس کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کمزور ہو' احتجاج نہ کر سکے اور وہ قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق اسے اندر ہی اندر پی رہا ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے جذبات مجروح نہیں ہوئے۔ یہی چیز وہ صورت اختیار کر سکتی ہے جیسے دو اینٹوں کے درمیان ان کو جوڑنے والا مسالہ کمزور پڑ جائے اور اپنی جگہ چھوڑ دے تو یہ چیز دشمن کے اندر در آنے کا سبب بن سکتی ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ ایسے تمام رخنوں کو بند رکھنے کا اہتمام کرو۔ اس معاملہ میں احتیاط کا دامن تھامے رکھو۔

یہاں پھر دیکھئے کہ مؤثر اپیل کی انتہا ہے۔ دلنشین پیرایۂ بیان اختیار فرمایا گیا ہے۔ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ۔ "ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی برا ہے"۔ جب اللہ نے ایمان جیسی دولت تمہیں عطا فرمائی' تمہیں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہونے کا شرف عطا فرمایا تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور پستی کی طرف تمہارا یہ رجحان اس مقام سے مناسبت رکھنے والی چیز نہیں ہے جو اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔

اس ترغیب کے ساتھ ہی اب ترہیب و تہدید اور دھمکی بھی ہے۔ ارشاد فرمایا: وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ "اور جو باز نہیں آئیں گے' رجوع نہیں

کریں گے' اللہ کی جناب میں توبہ نہیں کریں گے تو جان لو کہ اللہ کے نزدیک ایسے لوگ ہی ظالم ہیں" ۔ یعنی ایسے لوگوں کو آخرت میں اپنے ایسے تمام افعال و اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی اور ان کی سزا بھگتنی ہوگی' ان تمام چیزوں کو ACCOUNT FOR کرنا پڑے گا۔ یہ چیزیں ایسے ہی نہیں رہ جائیں گی جن کا حساب نہ لیا جائے۔

اگلی آیت میں پھر تین احکام بصورتِ نواہی آئے۔ اور قرآن مجید کا اعجازِ بیان دیکھئے کہ ان چھ باتوں کو دو آیتوں میں تقسیم کیا' تین پہلی آیت میں اور تین دوسری آیت میں۔ لیکن پہلی آیت میں وہ تین باتیں آئی ہیں جو رُودَرُو ہوتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ طنز سامنے کیا جائے گا' طعنہ سامنے دیا جائے گا' تمسخر و استہزاء سامنے ہی کیا جائے گا' تب ہی تو اس سے لذّت حاصل ہوگی۔ اسی طریقے سے کسی کو برے نام سے پکارنے کا معاملہ بھی علی الاعلان ہو گا۔ اگلی آیت میں ان تین برائیوں کا بیان آرہا ہے جن کا اخفاء کے ساتھ یا پیٹھ پیچھے ارتکاب ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۔ "اے اہلِ ایمان' گمان کی کثرت سے بچو" ۔ یعنی خواہ مخواہ کسی کے بارے میں دل میں ایک گمان قائم کر لینا' کسی کے بارے میں خواہ مخواہ دل میں کوئی برا خیال بٹھا لینا' خواہ مخواہ کسی کے بارے میں دل میں یہ رائے قائم کر لینا کہ اسے مجھ سے دشمنی ہے' اسے مجھ سے کد ہے' جبکہ اس کے لئے کوئی دلیل اور بنیاد موجود نہ ہو۔ اسی طرح خواہ مخواہ کسی کے بارے میں کسی اور اعتبار سے سوئے ظن قائم کر لینا' اس سے روکا گیا۔ یہاں بھی اپیل کا انداز دیکھئے ارشاد ہوا' اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ "یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں" ۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا کوئی گمان درست ہو لیکن یہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ گمان تو گمان ہی ہے' علم تو نہیں ہے۔ لہٰذا تم نے بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی بنیاد کے کسی مسلمان بھائی کے بارے میں کوئی برا خیال اپنے دل میں بٹھا لیا ہے' کوئی غلط رائے قائم کر لی ہے تو یہ گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی پکڑ ہوگی اور تمہیں اس پر سزا بھگتنی پڑے گی۔

دوسری بات فرمائی۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا۔ کسی کی ٹوہ میں رہنے اور تجسّس سے منع کیا جا رہا ہے..... اس کی مثال ایسی ہے جیسے مکھی بیٹھنے کے لئے گندگی تلاش کرتی ہے' ایسے ہی بعض پست ذہنیت رکھنے والے لوگوں کا یہ ایک ذوق اور مشغلہ ہوتا ہے کہ اس ٹوہ میں لگے رہیں کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے' ان دو بھائیوں کے تعلقات ٹھیک ہیں' اس کی کیا وجہ ہے! ان دو دوستوں میں بڑا گہرا قلبی تعلق ہے' ایسا کیوں ہے! کہیں کوئی ایسی بات سامنے آئے جس سے

ان کا کوئی اختلافی معاملہ ہمارے علم میں آجائے۔ اس تجسس اور ٹوہ کے وطیرے سے روکا گیا۔ بلکہ احادیث میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ تعلیم دی ہے اور تلقین فرمائی ہے کہ "اگر تمہارے کسی بھائی کا کوئی عیب بغیر اس کے کہ تمہارا اس کو جاننے کا ارادہ تھا' تمہارے علم میں آجائے تو حتی الامکان اس کی پردہ پوشی کرو۔ اگر دنیا میں تم اپنے کسی مسلمان بھائی کے عیب کی پردہ پوشی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری آخرت میں پردہ پوشی فرمائے گا"۔ اس تلقین' اس تعلیم اور اس اخلاقی ہدایت کو سامنے رکھیں تو ایک مسلم معاشرے میں برکات ہی برکات مشہود ہوں گی۔

اس آیت میں تیسری اور آخری بات فرمائی: وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا۔ "اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو"۔ کسی کے پیٹھ پیچھے' کسی کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت ہے جبکہ نیت اس کی توہین و تذلیل کی ہو۔ اس کے بارے میں بری بات کو اس ارادے سے لوگوں تک پہنچانا اور پھیلانا تاکہ لوگوں کی نگاہ میں اس کی وقعت نہ رہے۔ اسی آیتِ مبارکہ میں اس غیبت کی مذمت بڑے شدید انداز میں بیان ہوئی' ارشاد ہوا: اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ۔ "کیا تم میں سے کوئی شخص اس کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے' پس اسے تو تم بہت ناگوار سمجھتے ہو"۔ اب دیکھئے کہ اس میں مناسبت کیا ہے؟ جو شخص فوت ہو چکا ہے' وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا۔ آپ جہاں سے چاہیں اس کی بوٹی اڑالیں۔ اسی طریقے سے جو شخص موجود نہیں ہے' وہ اپنی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ آپ جو چاہیں اس کے پیٹھ پیچھے اس کے بارے میں کہہ دیں۔ وہ کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی صفائی اور مدافعت میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہو' ہو سکتا ہے کہ آپ اس کے بارے میں جو بات کہہ رہے ہیں' وہ غلط ہو۔ اگر وہ موجود ہو گا تو وہ وضاحت کر سکے گا۔ لیکن اگر وہ موجود نہیں ہے تو وہ اپنی عزت کی حفاظت اُسی طریقے سے کرنے سے قاصر ہے جس طریقے سے ایک مردہ لاش اپنے جسم کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ اگر آپ نے اپنے کسی غیر موجود مسلمان بھائی کی کوئی برائی بیان کی ہے تو یہ غیبت ہے اور درحقیقت۔ اخلاقی سطح پر بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی مردہ بھائی کی لاش سے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہوں۔

البتہ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ تینوں چیزیں وہ ہیں جن میں کچھ استثناءات ہیں۔ بعض قرائن اور ظاہری شواہد کی بنیاد پر کسی کے متعلق بدگمانی دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت

میں ضروری ہو گا کہ جلد از جلد اس کے متعلق اپنی استعداد کے مطابق تحقیق کر لی جائے۔ اسی طریقے سے حکومت تفتیش اور صحیح صورتحال معلوم کرنے کے لئے تجسس کر سکتی ہے۔ وہ یہ جاننے کے لئے تجسس کا ایک مستقل شعبہ اور محکمہ قائم کر سکتی ہے کہ ملک میں غیر ممالک کے جاسوس تو سرگرم عمل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں وہ خود بھی دوسرے ممالک میں جاسوسی کا کوئی نظم قائم کرے تو یہ غلط نہیں ہو گا' چونکہ اس مقصد کے پیچھے ملک کی سلامتی کی مصلحت کارفرما ہوتی ہے مزید یہ کہ کسی خاندان میں آپ اپنی اولاد کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں یا کسی خاندان سے آپ کے بیٹے بیٹی کے لئے رشتہ آیا ہے تو آپ صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے تجسس یا بالفاظ دیگر تحقیق و تفتیش کر سکتے ہیں۔ اسی طریقے سے اس نیت اور ارادے کے بغیر کہ اپنے کسی بھائی کی عزت پر حملہ کرنا مقصود ہو' اگر کسی مسلمان کی کوئی برائی بیان کرنے کی ناگزیر ضرورت پیش آجائے مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آپ کے کسی بھائی کا کہیں رشتہ طے پا رہا ہے اور وہاں کی کوئی غیر مناسب بات آپ کے علم میں ہے تو آپ اپنے اس دینی بھائی کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت اسے وہ بات بتا رہے ہیں تو یہ غیبت شمار نہیں ہو گی۔ مزید برآں جہاں واقعتہً کوئی تمدنی ضرورت ہو تو کسی کی غیر موجودگی میں اس کی کسی بری بات کو جو فی الواقع اس میں ہو بیان کر دینا غیبت کی تعریف سے خارج ہو جائے گا۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ○ "اور (ہر حال میں) اللہ کی نافرمانی سے بچو (اگر خطا ہو جائے تو اس کے حضور میں توبہ کرو) یقیناً اللہ نہایت معاف کرنے والا' رحم فرمانے والا ہے"۔ کسی بندۂ مومن سے خطا ہو جائے تو اس کے لئے صحیح ترین رویّہ یہ ہے کہ وہ اس پر پشیمانی کا اظہار کرے اور اللہ کی جناب میں رجوع کرے اور اس سے توبہ اور معافی کا طالب ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کو نہایت معاف فرمانے والا' توبہ قبول فرمانے والا اور رحم فرمانے والا پائے گا۔

بہرحال ان دو آیات میں چھ نواہی بیان ہوئے۔ تمسخر و استہزاء سے بچنا' عیب جوئی اور عیب چینی سے بچنا' ایک دوسرے کے برے نام رکھنے سے بچنا' سوئے ظن سے اجتناب کرنا' تجسس سے بچنا اور غیبت سے بچنا۔ ان کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو ایک مسلم معاشرے میں افراد کو ایک دوسرے سے کاٹنے یا گروہوں' خاندانوں' کنبوں کے درمیان رشتۂ محبّت اور اخوّت و مودّت کو منقطع کرنے کے لئے جو رخنے پیدا ہو سکتے ہیں' ان سب کا سدِّباب ہو جائے گا۔

اب آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے' اس کے بارے میں کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال وجواب

○ ..... سوال..... ڈاکٹر صاحب! آج کے درس سے معلوم ہوا کہ غیبت گناہ کبیرہ ہے تو یہ صرف توبہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے یا جس کی غیبت کی گئی ہے اس سے معافی طلب کرنے سے معاف ہو گا؟۔

☆ ..... جواب..... یہ گفتگو ان مجالس میں پہلے توبہ کے ضمن میں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کے درس میں آ چکی ہے کہ ان گناہوں کے معاملے میں جو حقوق اللہ سے متعلق ہوں..... مجرّد پشیمانی اور اس گناہ سے آئندہ اجتناب کے عزمِ مصمّم کے ساتھ توبہ کفایت کر جاتی ہے۔ لیکن حقوق العباد میں اس بندے سے جس کا حق تلف کیا گیا ہے یا جس کی غیبت کی گئی ہے معافی حاصل کی جائے یا اس کے حق میں کثرت سے مغفرت کی دعا کی جائے۔ ویسے شریعت کا منشاء یہ نظر آتا ہے کہ اگر اس بندے نے معاف نہیں کیا ہے تو آخرت میں DEBIT یا CREDIT ہو کر رہے گا۔ جس کی غیبت کی گئی ہے' جس کی عزت پر حملہ کیا گیا ہے یا تو اس کے نامۂ اعمال کی کچھ برائیاں غیبت کرنے والے کے نامۂ اعمال میں درج ہوں گی یا اس کی کچھ نیکیاں اس کو دی جائیں گی۔ مجرّد توبہ سے اس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔

○ ..... سوال..... ڈاکٹر صاحب! کیا کوئی شخص اپنے کسی دوست کا کوئی عیب اس سے بیان کر سکتا ہے؟۔

☆ ..... جواب..... یہ بہت عمدہ سوال ہے۔ غیبت کے مقابلے میں تو یہ رویّہ بہت بہتر ہے کہ کسی کی برائی اس کے سامنے بیان کی جائے۔ البتہ یہ خیال رکھنا ہو گا کہ سامنے بیان کرنے سے نیت کیا ہے! اس سے معاملہ کی نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جائے گا۔ اگر نیت اپنے اس دوست کی اصلاح کی ہے تو یہ کارِ ثواب ہے' اس پر اجر ملے گا۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس کے لئے بڑا ہمدردانہ انداز ہونا چاہئے۔ دل سوزی کے ساتھ اور خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ بات کی جائے اور یہ کہ لوگوں کے سامنے اسے ذلیل نہ کیا جائے' اس سے تنہائی میں بات کی جائے۔ یہ اس طرزِ عمل کے آداب ہیں اور اگر دوسروں کے سامنے بات کی جا رہی ہے تاکہ اس کی توہین و تذلیل ہو تو یہ لمز ہے۔ یہ اس نہی کی زد میں آ جائے گا جو زیرِ مطالعہ سورۂ مبارکہ کی گیارہویں آیت میں وارد ہوئی کہ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ "اپنے آپ کو

عیب نہ لگاؤ' ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو"۔ کسی کی توہین و تذلیل کی نیت سے اگر بات ہو گی تو وہ اس کے ذیل میں آئے گی اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔

حضرات! آج ہم نے چھ نواہی' یعنی وہ چھ باتیں جن کے ارتکاب سے ہمیں روکا گیا ہے سورۃ الحجرات کی دو آیات سے سمجھیں۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ چھ باتیں ہماری مجلسی زندگی میں بہت عام ہیں۔ تمسخر و استہزاء بھی ہے' لمز بھی ہے' تنابز بالالقاب بھی ہے' سوئے ظن بھی ہے' تجسس بھی ہے اور غیبت بھی ہے...... پس ہم قرآن مجید کی جو کچھ تعلیمات و ہدایات ان مجالس میں پڑھ رہے ہیں یا سن رہے ہیں' ہمیں ان پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے' ورنہ محض اس پڑھنے اور سننے سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ فائدے کی صورت صرف یہی ہے کہ جو علم بھی ہمیں حاصل ہوا سے ہم اپنی زندگیوں میں جذب کر لیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العٰلمین۔

و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا

"اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جب باہم عہد کر لیں" (البقرہ: ۱۷۷)

MOVING & STORAGE

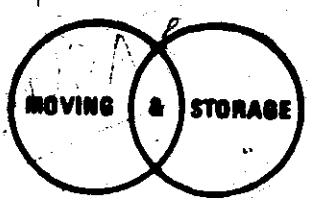

VANPAC (PAK) INC.

VANPAC

P.O. BOX 6028
8-A, Commercial Building
Abid Majeed Road, Lahore Cantt. PAKISTAN
CABLES: "VANCARE"
PHONES OFF. : 372532 - 373446
RES. : 372618

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بحیثیت

داعیٔ انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک پُر تاثیر اور فکر انگیز خطاب

ترتیب و تسوید (شیخ) جمیل الرحمٰن

(۲)

ایمان بالتوحید کے تین لوازم

اسلامی انقلابی نظریہ اور فکر (IDEALOGY) کی بنیاد آخرت نہیں ہے۔ دراصل اسلامی انقلاب کے فکر اور نظریہ کی بنیاد نقطۂ توحید کی تین اہم ترین COROLLARIES ہیں یعنی اس کے وہ پہلے تین لازمی، بدیہی، توضیحی، تصریحی اور منطقی نتائج ہیں جو اجتماعی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے ایک ہے انفرادی توحید، عقیدہ کی توحید ــــ یعنی ایک انسان اپنی انفرادی اور شخصی زندگی میں مُوحِّد ہو گیا جب اس نے مانا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ کے سوا کوئی رازق نہیں، اللہ کے سوا کوئی مددگار، کوئی کارساز، کوئی دستگیر نہیں، کوئی حاجت روا اللہ کے سوا نہیں، اللہ کے سوا کوئی دعاء سننے والا نہیں ــــ اور اس نے ان معتقدات کے مقدرات اور متضمنات کے ساتھ اپنے آپ کو ہمہ تن، ہمہ وجوہ اللہ کے آگے ڈال دیا تو یہ اس کی انفرادی توحید ہے۔

لیکن اسی نقطۂ توحید کی تین اہم ترین تشریحات، توضیحات، مقتضیات متعلق ہیں نظامِ اجتماعی سے ــــ اور انقلاب نام ہے ہی اجتماعی نظام کے بدلنے کا۔ لہٰذا اگر نقطۂ توحید کے تین اہم ترین بدیہی پہلو اور نتائج پورے شعور و ادراک کے ساتھ سامنے موجود نہ ہوں تو صحیح اسلامی انقلابی عمل کا آغاز نہیں ہو سکے گا۔

پہلا لازمہ : کامل مساواتِ انسانی

وہ تین COROLLARIES ، وہ تین لازمی و بدیہی پہلو اور نتائج کیا ہیں ؟ ـــــ ان میں سے ایک وہ ہے جو میں ایچ جی ویلز کے حوالہ سے بیان کر چکا ـ کامل انسانی مساوات (COMPLETE HUMAN EQUALITY) ـــــ اچھی طرح مستحضر رہے کہ میں معاشی مساوات نہیں کہہ رہا ـ کامل انسانی مساوات کہہ رہا ہوں ـــ کوئی انسان اعلیٰ نہیں، کوئی انسان ادنیٰ نہیں، کوئی انسان بڑھیا نہیں، کوئی گھٹیا نہیں، کوئی انسان اونچا نہیں کوئی نیچا نہیں ـ تمام انسان مساوی ہیں ـــ اس لئے کہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی اللہ کی مخلوق ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے آدمؑ اور حوّا کی نسل سے ہے ـــ وحدتِ انسانی کا یہ ہے وہ نکتہ جس پر ایچ جی ویلز جیسے دشمنِ رسولؐ (جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو خواہی نخواہی TRIBUTE پیش کرنا پڑا ہے، خراجِ تحسین و عقیدت ادا کرنا پڑا ہے ـ اس نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں ایسے شاندار الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ انسانی مساوات کی تعبیر و توضیح اس سے زیادہ فصیح و بلیغ اسلوب سے ممکن نہیں ـــ حضورؐ نے قریباً سوا لاکھ صحابہ کرامؓ کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> لیس لعربیٍ علی عجمیٍ فضل ولا لعجمیٍ علی عربیٍ فضل ولا لأسود علیٰ أبیض فضل ولا لأبیض علیٰ اسود فضل إلّا بالتّقویٰ ـ کلکم بنوآدم و آدم من تراب ـ

(ترجمہ) "نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر فضیلت حاصل ہے نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فضیلت حاصل ہے ـ بنائے فضیلت صرف تقویٰ ہے ـ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے تخلیق ہوئے تھے ـ"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا:

(ترجمہ) "تمام نسلی اور قبائلی تفاخرات آج میرے ان دونوں قدموں کے تلے ہیں ـ میں نے آج انہیں کچل کر رکھ دیا ہے ـ"

یہ بہت بڑی انقلابی بات ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی یہ بہت بڑا انقلابی تصور ہے جسے نوعِ انسانی کو دینے والے اور اس انقلابی تصور پر کرۂ ارضی پر پہلی بار ایک معاشرہ

بالفعل قائم کرنے والے ہیں رحمۃ للعٰلمین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ فداہ ابی و امی۔

موجودہ دنیا کا جائزہ : اس تناظر میں پہلے تو موجودہ دنیا کا ایک طائرانہ جائزہ لیجئے جو تمدنی اعتبار سے بڑی ترقی یافتہ، روشن خیال دنیا کہلاتی ہے اور مغربی ممالک بشمول برّاعظم امریکہ بزعم خود دنیا کی مہذب ترین، روشن خیال، وسیع النظر، تعلیم یافتہ (CULTURED) ہونے کے مدّعی ہیں۔ ان کے ہاتھوں افریقہ کے حبشیوں اور امریکہ کے نیگروں کے ساتھ رنگ و نسل کی بنیاد پر جو ناروا امتیازی سلوک کیا جارہا ہے اور ان پر ظلم و ستم کے جو مسلسل پہاڑ ڈھائے جاتے رہے ہیں، پوری دنیا ان سے واقف ہے۔ پھر ہندوؤں کے یہاں جو ذات پات اور چھوت چھات ہے، وہ تو ہم میں سے اکثر کے تجربہ و مشاہدہ کا معاملہ ہے ـــــ ہم ان کو بُرا بھلا کہہ کر اپنا دل خوش کر لیتے ہیں۔ اپنے گریبانوں میں نہیں جھانکتے کہ دین سے دوری کے باعث خود ہمارا اپنا کیا حال ہے! ہم بھی زوال و انحطاط کی ان حدوں تک پہنچ گئے ہیں کہ ہمارے یہاں علاقائی، لسانی، قبائلی اور برادری نیز امیری غریبی اور نسلی امتیازات و تعصبات روز بروز بڑھتے جارہے ہیں۔ علامہ اقبال نے آج سے قریباً ساٹھ ستّر سال قبل اس کا گلہ کیا تھا کہ:

؎ یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

آج پہلے سے بھی دگرگوں حالت ہے۔ سیّد زادہ یا زمیندار یا وڈیرہ یا جاگیردار زانی اور شرابی ہو تب بھی اس کے گھٹنے کو ہاتھ لگایا جائے گا۔ اور اگر کوئی بے چارا چوڑھا چمار بھی مسلمان ہو اسے یا پہلے سے مسلمان ہے، وہ سیّد زادے اور وڈیرے کے ساتھ چارپائی یا صوفہ پر برابر نہیں بیٹھ سکتا۔ آج ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ہمارے نزدیک بھی وجہ اکرام اور شرافت یا نسل ہے، یا مال و دولت ہے یا دنیوی وجاہت ہے یا برادری، قبیلہ، علاقہ اور زبان کا تعلق ہے ـــ ادھر یہ صورتِ حال ہے، اُدھر کا معاملہ دیکھئے۔ توحید کی انقلابی دعوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور تزکیہ کا یہ فیضان ہے کہ ایک حبشی النسل، سیاہ فام، زبان سے شین ادا نہ کر سکے، آزاد کردہ غلام ـــ اور اسے وہ شخص جو کبھی سب سے بڑا نسلی متعصّب (RACIST) تھا ـــ جان لیجئے کہ مکّہ میں بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے وقت عمر ابن الخطاب اور عمرو ابن ہشام (ابوجہل) سے بڑا نسل پرست انسان (RACIST) کوئی اور نہیں تھا۔ نسل پر فخر کرنے والے، اس پر مرمٹنے والے۔ اس اعتبار سے یہ دونوں ہم وزن شخصیت تھے۔ قرشیّت کی مفاخرت و محافظت میں یہ دونوں سب سے آگے تھے۔ اپنے آبائی مشرکانہ دین سے شدید محبّت اور عقیدت حتیٰ کہ

عصبیت میں بھی دونوں مساوی تھے۔ ان معاملات میں حضرت عمرؓ بھی ابوجہل سے کم نہیں تھے ـــــ یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حضور ان دونوں کا نام پیش فرمایا تھا کہ " اے اللہ! عمر ابن الخطّاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے ایک کو تو ضرور میری جھولی میں ڈال دے " پھر یہی عمر ابن الخطّاب ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی یہ قلب ماہیت ہوئی ہے کہ وہؓ فاروق اعظم اور دوسرے خلیفہ راشد بنے ہیں۔ فضیلت کے لحاظ سے پوری امت میں اُن کا مقام و مرتبہ بالاتفاق دوسرے نمبر کا ہے۔ پہلے مقام و مرتبہ پہ صدیق اکبر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فائز ہیں ـــ اُن عمرؓ کا جو ایّام جاہلیت میں کٹر نسل پرست تھے، حال یہ ہے کہ وہ حضرت بلالؓ کا نام نہیں لیتے تھے جب تک "سیّدنا" نہ کہہ لیں ـــ سیّدنا بلالؓ۔ ہمارے آقا بلالؓ ـــ کہاں بادۂ توحید سے شاد کام ہونے سے پہلے نسل پرستی کی وہ انتہا اور کہاں دولت توحید سے مالامال ہونے کے بعد کی یہ کیفیت!

ؔ ببیں تفاوتِ رہ از کجا تا بکجا

پس اچھی طرح جان لیجئے کہ نقطۂ توحید کی پہلی ' COROLLARY ' اس کا پہلا بدیہی نتیجہ ہے خالص انسانی مساوات ـــ قانونی سطح (LEGAL LEVEL) پر جو فرق ہوگا بھی تو اس بنیاد پہ کہ کون اللہ کا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیوا ہے اور کون نہیں : هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ " وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن" (التغابن-۲) ـــ یہ ہے ہماری معاشرت کی اوّلین اساس ـــ نقطۂ توحید کا پہلا بدیہی نتیجہ!!

رہی اکرام و شرافت کی بنیاد! تو وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں کون زیادہ متقی ہے۔ سورۃ الحجرات میں اس اصل الاصول کو نہایت فصاحت، بلاغت اور وضاحت سے بیان کر دیا گیا۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ

(ترجمہ) " اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے جُدا جُدا خاندان اور قبیلے بنائے ہیں تاکہ باہم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو (نہ کہ تفاخر اور تکبر کے لئے)۔ بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک شریف، عزّت دار اور لائق اکرام وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، (اللہ کی نافرمانی سے بچنے اور اس کے احکام پر چلنے والا ہو) بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے " (آیت: ۱۳)

معاشرتی سطح پر نقطۂ توحید کی پہلی 'COROLLARY' یہ سامنے آئی کہ پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ قانونی طور پر فرق کفر و اسلام کا ہے اور اسلام میں عزّت و شرافت اور اکرام کا معیار اتقٰی (زیادہ متقی ہونا) ہے۔ غلام زادہ ہو، پیشہ کے اعتبار سے لوہار ہو، جولاہا ہو، کفش دوز ہو، نسل کے اعتبار سے چمار زادہ ہو اگر اس میں تقوٰی زیادہ ہے تو ہمارا پیشوا اور امام بن سکتا ہے۔ اور ہمارے سلف کی تاریخ میں یہ ہوا ہے کہ خلفاء اور شہزادوں نے ایسے حضرات کی جوتیاں سیدھی کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھا ہے اس لئے کہ وہ بزرگ تقوٰی میں، علم میں، تدیّن میں آگے نکل گئے تھے۔

دُوسرا لازمہ: انسانی حاکمیّت کی نفی

نقطۂ توحید کی دوسری 'COROLLARY' دوسرا بدیہی نتیجہ ہے سیاسی سطح پر ــــ حاکمیتِ مطلقہ اللہ کے سوا کسی کی نہیں۔ سب محکوم ہیں کوئی حاکم نہیں۔ سب بندے ہیں۔ کوئی آقا نہیں۔

؎ تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے

سیاسی اعتبار سے کامل مساوات ــــ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس ضمن میں بڑی پیاری بات فرمائی کہ:

کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا ؕ

"بن جاؤ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی"۔

سب بندے ہیں، سب غلام ہیں۔ آقا صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ ــــ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کل کائنات کا مالک اور آقا ــــ اور اس اعتبار سے اختیارِ مطلق صرف اللہ کا ہے: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔

؎ سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

اس کائنات کی بادشاہت و حاکمیت مطلقہ کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے واشگاف فرمایا گیا ہے۔ چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ــــ کہیں فرمایا: اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ــــ کہیں ارشاد ہوتا ہے: تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ ــ کہیں فرمایا جاتا ہے: لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اور لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِیْہِنَّ۔

اطاعتِ رسولؐ : اطاعتِ الٰہیہ کا بنیادی پتھر

البتہ دنیا میں، عالمِ واقعہ میں اور تشریعی امور میں حاکمیتِ الٰہیہ پر عمل درآمد ہوتا ہے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ——— کی صورت میں۔ اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے مطاعِ اللہ کا رسولؐ ہے ——— وہی اللہ کے احکام، اس کے اوامر و نواہی، اس کی شریعت انسانوں تک پہنچاتا ہے لہٰذا اس کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے : مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی پس یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ اور : وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ——— لیکن اصل الاصول یہی ہے کہ : اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ "حکم کا اختیارِ مطلق اللہ کے سوا کسی کو نہیں" ——— کوئی نظام ہو! ملوکیت ہو، سول (CIVIL) حکومت ہو، فوجی آمریت ہو۔ اگر "حاکم" اور کوئی دوسرا شخص قانونِ عدالت سے مستثنیٰ قرار پاتا ہو یا کسی شخص یا کسی "حاکم" کا حکم عدالتی معیار سے بالاتر اور عدالت کے حیطۂ اختیار سے باہر قرار دیا گیا ہو تو درحقیقت وہ شخص خدائی کا مدعی ہے۔ جو چاہے فرعون ہو، نمرود ہو، شدّاد ہو ——— یہ وہ بدبخت ہیں جنہوں نے زبان سے بھی "خدائی" کا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن اگر کوئی بادشاہ، کوئی شہنشاہ، کوئی ڈکٹیٹر، کوئی فوجی آمر چاہے زبان سے خدائی کا مدعی نہ ہو لیکن اگر کوئی "حکمران، قرآن و سنت سے آزاد حاکمیت کا مدعی ہو، خود کو مقتدرِ اعلیٰ سمجھتا ہو تو حقیقتِ نفس الامری کے اعتبار سے وہ بھی "خدائی کا مدعی" ہے چاہے وہ زبان سے اس کا دعویٰ نہ کرے۔

آزاد جمہوریت بھی کفر ہے

اسی طرح اگر کسی ملک کے باشندوں کی منتخب کردہ پارلیمنٹ یا اسمبلی 'SOVEREIGNTY' یعنی حاکمیتِ مطلقہ کا دعویٰ (CLAIM) کرتی ہے کہ ہمیں اختیار ہے کہ اکثریت کی آراء سے ہم جو چاہیں قانون بنا دیں، جو چاہیں طے کر دیں تو دراصل یہ بھی اپنی روح (SPIRIT) اور اساس (FOUNDATION) کے اعتبار سے "خدائی کا دعویٰ" ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے ایک فرعون، ایک نمرود، ایک شدّاد ہوتا تھا جو زبان سے بھی خدائی کے دعویدار تھے۔ اب عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے پارلیمنٹ یا اسمبلی نے فرعون، نمرود، شدّاد کی جگہ لے لی ہے۔ پس یہ

عوامی حاکمیّت جس کی تعبیر "جمہوریت" ہے درحقیقت عوامی (POPULAR) فرعونیت ہے۔ یہ عوامی نمرودیّت ہے، جس کا نام POPULAR SOVEREIGNTY (عوامی حاکمیت) رکھ دیا گیا ہے۔ اس بات کو بڑے خوبصورت انداز میں علّامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس سے یوں کہلوایا ہے:

ے ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر

یہی کچھ ہوا ہے کہ پہلے کفر کا ایک شخصیت، ایک ذات یا ایک طبقے میں ارتکاز تھا، اب اس کفر کو خدانا آشنا جمہوریت کا نام دے کر پھیلا دیا گیا ہے ــــ ہے وہی کفر جو پہلے ایک شخص یا ایک طبقہ یا ایک خاندان میں مرتکز ہوتا تھا۔ اب اسے عوام میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ہے وہی کفر۔ اقبال کا یہ شعر دوبارہ سنا رہا ہوں۔ چونکہ علّامہ نے بڑے بلیغ اسلوب سے اس بات کو واضح کیا ہے:

ے سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!

حاکمیّتِ مطلقہ صرف اللہ عزّوجلّ کی ہے، یہ نقطۂ توحید کا دوسرا بدیہی نتیجہ ہے۔

تیسرا لازمہ: ملکیّتِ مطلقہ کی نفی۔ اس کی جگہ تصورِ امانت

نقطۂ توحید کی تیسری " COROLLARY " یعنی اس کا تیسرا بدیہی نتیجہ ہے کہ ملکیّتِ مطلقہ صرف اللہ کی ہے۔ کوئی کسی شے کا مالک نہیں ہے۔ جس کو جو کچھ ملا ہے امانت ہے۔ امانت میں تصرّف اصل مالک کی مرضی کے مطابق ہو تو درست ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف تصرّف ہے تو خیانت ہے۔ شیخ سعدیؒ نے اس بات کو نہایت خوبصورت انداز میں ادا کیا ہے:

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
درحقیقت مالکِ ہر شے خدا است

سورۃ الحدید میں اللہ پر اور اس کے رسول پر ۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم ۔ ایمان لانے کی پُرزور دعوت دینے کے بعد فرمایا: وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ـــ "اور (اللہ کی مرضی کے مطابق اس مال میں سے) خرچ کرو جو اس نے تمہیں دیا ہے اپنا خلیفہ (نائب) بنا کر" ــ یعنی جو مال تمہارے پاس

ہے تم اس کے خالق و مالک نہیں بلکہ تم مُستَخلَف ہو۔ تم صرف اس کے امین ہو۔ لہٰذا اس کے اصل مالک و معطی اللہ کی مرضی کے مطابق اس میں تصرّف کا تمہیں اختیار ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں ارشاد ہوا : وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ "آسمان اور زمین (سب کا) وارث اللہ ہی ہے"۔ تم جو مال و اسباب کو اپنی ملکیتِ مطلقہ سمجھ بیٹھے ہو تو یہ تمہارے نفس کا فریب ہے۔ مجازی اور عارضی طور پر تم مالک ہو لیکن بہرحال تم کو ایک دن مرنا ہے اور سب ساز و سامان یہیں چھوڑنا ہے۔ پس تم نے اس کا حقیقی مالک خود کو کیسے سمجھ لیا! تمہارا یہ سمجھ بیٹھنا سراسر فریب ہے، دھوکہ ہے، بہت مہلک مغالطہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر ان الفاظِ مبارکہ کا اعادہ ہوا ہے کہ: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ۔ شاید اللہ تعالیٰ کی کوئی دوسری شان اتنی مرتبہ اور اتنی تکرار کے ساتھ نہ آئی ہو۔ ان الفاظ پر گہرائی میں اتر کر غور و تدبّر کیجئے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہو جائے گی کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ہے۔ سب کا مالک حقیقی صرف اس کی ذات تبارک و تعالیٰ ہے۔ اس اسلوب بیان نے کائنات کی ہر شے کا احاطہ کر لیا۔ انسان بھی اس میں شامل ہے۔ اس دنیا میں انسان کو جو کچھ ملا ہے، چاہے وہ اموال و اسباب ہوں، صلاحیتیں اور توانائیاں ہوں ان سب کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ انسان کے پاس یہ سب امانت ہیں۔ انسان ان کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔ اور مال و دولت کا حصول بھی اسی کی مرضی کے مطابق اور جائز طریق سے ہو۔ پھر اس پر تصرّف بھی اسی کی مرضی کے مطابق ہو اور صرف جائز مدات پر ہو تو یہی حق ہے، یہی صحیح ہے، یہی درست ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ دلیل لائے کہ یہ میری چیز ہے، میں اس کا مالک ہوں، میں جیسے چاہوں استعمال کروں ـــ تو یہ قارونیت ہے ـــ جیسے علی الاطلاق حاکمیت کا دعویٰ نمرودیت و فرعونیت ہے، ویسے ہی ملکیتِ مطلقہ کا دعویٰ قارونیت ہے ـــ قرآن حکیم میں 'قارون' کے کردار کا ذکر کیوں آیا! اس سے جب کہا گیا کہ اللہ نے تجھے اتنی دولت دی ہے، اس سے خیر کے کچھ کام کرو، بھلائی کے کاموں میں اسے خرچ کرو تو اس نے نہایت تکبّر سے جواب دیا : اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ ـــ "یہ مال مجھے اپنے علم کے طفیل حاصل ہوا ہے"۔ ـــ میری ذہانت، میری فطانت، میری سوچ، میری منصوبہ بندی، میری محنت کا یہ نتیجہ اور ثمرہ ہے۔ یہ میرا مال ہے، میں جیسے چاہوں خرچ کروں۔ مجھے نصیحت کرنے والے تم کون ہوتے ہو!۔ (خیال رہے کہ قارون بنی اسرائیل میں سے تھا) ـــ پس جان لیجئے کہ یہی ذہنیت قارونیت ہے۔

یہاں تک کی گفتگو کا خلاصہ : وقت کم ہے لہٰذا میں تفصیلات سے صرفِ نظر کر رہا ہوں۔ ابھی جو

کچھ میں نے عرض کیا ہے اسے تمہیداً عرض کیا ہے اور میں نے آج کے موضوع پر قدرے مفصّل گفتگو کے لئے یہ تین اصول، تین اساسات بیان کی ہیں کہ ہمارے دین کی اصل، اس کی جڑ، اس کی بنیاد ایمان بالتوحید ہے۔ لہٰذا انقلابی عمل نقطۂ توحید اور اس کی تین فروع - تین بدیہی نتائج و ثمرات سے شروع ہوگا۔ یعنی کامل انسانی مساوات نمبر ایک ـــــ حاکمیتِ انسانی کی کامل نفی، اس کی جگہ تصوّرِ خلافت نمبر دو ـــــ اور ذاتی اور مطلق ملکیت کے بجائے تصوّرِ امانت نمبر تین ـــــ نبوی دعوت کا آغاز انذارِ آخرت سے ہوگا اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی انقلابی دعوت کا عمل ایمان بالتوحید اور نقطۂ توحید کی ان تشریحات سے شروع ہوگا جن کو میں نے مختصراً بیان کیا ہے۔

تکبیرِ ربّ ـــ انقلابِ نبویؐ کا اساسی نعرہ

میں نے آغاز میں سورۃ المدّثّر کی جو تین آیات تلاوت کی تھیں ان میں سے تیسری آیت کو ذہن میں لائیے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو حکم دیا جاتا ہے: وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ تکبیر سے مراد زبان سے "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" کہنا بھی ہے۔ لیکن تکبیر کے لغوی معنٰی ہیں "کسی چیز کو بڑا کرنا"۔ اس اعتبار سے اس آیت مبارکہ کا معنی و مفہوم ہوگا کہ (اے نبیؐ) اپنے رب کی کبریائی کا اعلان بھی کرو اور اس کو بالفعل قائم و نافذ بھی کرو۔ جس طرح اللہ کی تکوینی حکومت قائم و دائم ہے۔ اسی طرح دنیا میں انسان کو ارادے اور عمل کی جو آزادی و خودمختاری حاصل ہے اُسے انسان اپنی مرضی سے اس ہدایت کے تابع کر دے جو اس تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے توسط سے بھیجی ہے جس کی آخری کڑی ہیں جناب محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور جس ہدایت کا تاقیامِ قیامت مجموعہ ہے قرآنِ حکیم اور سنّتِ رسول اللہ علٰی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام ـــ اس دنیا کے تشریعی نظام میں اللہ تعالےٰ کو SOVEREIGN تسلیم کیا جائے۔ یہ ہے تکبیرِ ربّ کا مفہوم اور یہ بھی دراصل توحید کی انقلابی دعوت ہی کی ایک تعبیر ہے۔

انقلابِ محمّدیؐ کے چھ مراحل ـــ تین تمہیدی اور تین تکمیلی

اب اس مسئلہ کی طرف آئیے کہ اس انقلابی عمل کے مراحل کیا ہوں گے!۔ عملی اقدام کیا ہوگا! اس دعوت کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے مراتب و مدارج کیا ہوں گے!! سیرتِ مطہّرہ علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام سے میں نے چھ مراحل اخذ کئے ہیں۔ جن میں سے تین مراحل میرے نزدیک ابتدائی

یا تمہیدی ہیں اور تین مراحل تکمیلی ۔ میں پہلے تین ابتدائی یا تمہیدی مراحل آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ان کو انگلیوں پر گن کر ذہن نشین کر لیجئے ۔

پہلا مرحلہ = دعوت و تبلیغ

اس کا پہلا مرحلہ ہے دعوت و تبلیغ ۔ نظریۂ توحید کی نشر و اشاعت ۔ دعوت و تبلیغ ایک ہی کام کے دو رُخ ہیں ۔ دعوت کا معنی و مفہوم ہے کسی کام کی طرف بُلانا، پکارنا ۔ اور تبلیغ کا معنی و مفہوم ہے کسی پیغام کو، کسی دعوت کو دوسروں تک پہنچانا ۔ انہی دونوں کاموں کے لئے دلائل و براہین پیش کرنا ۔ لوگوں کے اذہان و قلوب، فکر و نظر کو مطمئن کرنا ۔ فطرتِ انسانی میں معرفتِ رب کے جو حقائق اور بدیہیات مضمر ہیں ان کو شعور کی سطح پر لانا ۔ اس دعوت و تبلیغ کا اصل آلہ ہے قرآن مجید، فرقان حمید جو اللہ کا پیغام ہے انسانوں کی طرف ۔ جو انسان کو ضلالت و گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر نورِ ہدایت کی طرف لاتا ہے ۔ جو توحید کی انقلابی دعوت کی اساسات کو مبرہن کرتا ہے اور ان کی حقانیت کو روزِ روشن کی طرح عیاں کرتا ہے : هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖٓ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔

دوسرا مرحلہ = تنظیم

اس کا دوسرا مرحلہ ہے تنظیم ۔ جو لوگ توحید کی انقلابی دعوت کو قبول کر لیں ۔ قرآن مجید پر ایمان لے آئیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ ربّ السّٰموٰت والارض کا انسانوں کے نام ہدایت کا پیغام ہے ۔ ۔ اس پیغام کو لانے والے کی تصدیق کریں کہ لاریب وہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور اس بات پر یقین رکھیں کہ معاد حق ہے، آخرت حق ہے، بعث بعد الموت حق ہے، حشر و نشر حق ہے ۔ تمام انسان حیاتِ دنیوی کے محاسبہ کے لئے اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے ۔ وہ دن شدنی ہے کہ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ان لوگوں کو منظم (ORGANISED) کیا جائے ۔ انہیں بنیانِ مرصوص بنایا جائے چونکہ انقلاب تنظیم کے بغیر آ ہی نہیں سکتا ۔ انقلابی تنظیم کے بغیر فکر پھیل سکتا ہے ۔ وہ خودرو گھاس کی طرح پروان بھی چڑھ سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس روئیدگی میں کوئی نظم نہیں ہوگا ۔ کیفیت یہ ہوگی کہ زمین کہیں اونچی، کہیں نیچی اور کہیں خالی نظر آئے گی ۔ ۔ لیکن انقلاب ایک منظم جدّ و جہد کے ذریعے سے اور اس کے نتیجہ میں آتا ہے ۔ لہٰذا اس کے لئے ایک ایسی جماعت

ہونی ضروری ہے جس کا ڈسپلن (DISCIPLINE) مثالی ہو اور مثالی ڈسپلن کے لئے دنیا میں ایک ہی معیار ہمارے سامنے ہیں جس کو ہم " فوج کا ڈسپلن " (ARMY DISCIPLINE) کے نام سے جانتے ہیں ۔فوجی ڈسپلن کے متعلق یہ بات ایک مسلّمہ کے طور پر معروف و مشہور ہے کہ فوج کے ہر سپاہی پر صرف سننے سے حکم کی تعمیل لازم ہو جاتی ہے ۔ایک کمانڈر کا حکم جیسے ہی کانوں تک پہنچ جائے اس حکم کو بجا لانا فوجی ڈسپلن کا لازمی تقاضا ہے ۔کوئی حیل و حجت نہیں ہو سکتی ۔کوئی چیز بھی اس میں مداخلت (INTERVENE) نہیں کر سکے گی ! ـــــ کسی حکم پر کوئی اعتراض وارد نہیں کیا جا سکے گا ـــــ یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ اس حکم کی مصلحت اور غرض و غایت کیا ہے !!

البتہ انجمنوں اور اداروں کو اس طور پر چلایا جا سکتا ہے کہ وابستہ لوگوں کی رائے معلوم کی جائے اور اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلے ہوں اور ان پر عمل درآمد ہو ۔سیاسی جماعتیں اور جمعیتیں بھی اس طریق پر چل سکتی ہیں بلکہ چلنی چاہئیں ـــــ لیکن دو کاموں میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ان میں ان چیزوں کو ACCOMODATE نہیں کیا جا سکتا ۔ایک تو کسی انقلابی جماعت میں اور دوسرے فوج میں ۔ ـــــ فوج کے لئے تو صحیح ترین معیار وہ ہے جس کا نقشہ انگریزی کی مشہور نظم " CHARGE OF THE LIGHT BRIGADE " میں کھینچا گیا ہے ۔فوج کے ایک دستے کو حملہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور سب کو نظر آ رہا ہے کہ کوئی بڑی غلطی ہو گئی ہے لیکن دستہ حملہ کرتا ہے اور پورا دستہ ہلاک ہو جاتا ہے ۔نظم سنئے :

"SOME ONE HAS BLUNDER;
CANNONS TO RIGHT OF THEM;
CANNONS TO LEFT OF THEM;
CANNONS TO FRONT OF THEM;
CANNONS BEHIND THEM"

ہر چہار طرف سے توپوں کے دہانے کھلے ہوئے ہیں ۔چہار سو سے موت لپک رہی ہے لیکن چونکہ حملہ کا حکم مل گیا ہے لہٰذا CHARGE کیا گیا ہے ۔اس لئے کہ ڈسپلن کا تقاضا یہی ہے ـــــ نظم کے آخر میں آتا ہے کہ :

"THEIR'S NOT TO REASON WHY?
THEIR'S BUT TO DO AND DIE."

فوج میں " کیوں اور کیسے ؟ " کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔وہاں تو یہ ہے کہ ' سنو اور اطاعت کرو ' ـــــ 'LISTEN AND OBEY'

قرآن وحدیث اور سمع وطاعت: آپ غور کیجئے کہ قرآن مجید میں کتنی بار حکم آیا ہے کہ: فَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا! "پس سنو اور اطاعت کرو" اور اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ــ "جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی" ــــ شبِ معراج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ بقرہ کی جن دو آیات کا تحفہ عطا ہوا، ان میں مومنین صادقین کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ: وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ○ "اور انہوں نے کہا: ہم نے حکم سنا اور اطاعت کی۔ اے ربّ ہمارے، ہم تجھ سے مغفرت کے طلب گار ہیں اور ہمیں آخر کار تیری ہی طرف پلٹنا ہے" ــــ

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس حدیث کو ہم نے بہت عام کیا ہے جس کو امام ترمذیؒ اور امام احمدؒ ابن حنبل نے اپنی اپنی کتبِ احادیث میں روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ ان میں سے پہلے تین حکم آج کی گفتگو سے متعلق ہیں۔ حضورؐ نے حکم دیا 'جماعت' کا اور 'سمع وطاعت' کا یعنی انقلاب محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے جماعت یعنی تنظیم لازم ہے ــ اور یہ جماعت ہو 'سمع وطاعت' والی ــ اس کا حال یہ ہو کہ 'LISTEN AND OBEY' ــــ "سنو اور اطاعت کرو" ــــ یہ ہے وہ تنظیم جو جنابِ محمدؐ نے قائم فرمائی۔ صلی اللہ علیہ وسلم ــــ

سمع واطاعت کے دو درجے

اس 'سمع وطاعت' کے بھی دو درجے ہیں۔ اُن کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے ــــ

پہلا درجہ: رسول اللہ کی اطاعتِ مطلقہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو صاف تھا۔ چونکہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور جس نے حضورؐ کو اللہ کا رسول مان لیا وہ تو بالکلیہ مطیع ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھنا کہ آپؐ یہ حکم کیوں دے رہے ہیں! ایمان کی نفی کر دے گا۔ آپؐ کے متعلق تو یہ تسلیم کر لیا گیا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، اس کے نمائندے ہیں: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ ــ لہٰذا کسی چون وچرا کی گنجائش ہے ہی نہیں۔ چون وچرا کی اور ایمان کے لالے پڑے ــــ ادھر نبی اور رسولؐ ہیں اور ادھر امتی ہیں ــــ امتی ہونے کے رشتہ کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سنیں اور اطاعت کریں: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ــ "کسی مرد مومن اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں

ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے جب حکم آجائے پھر بھی وہ سوچیں کہ ان معاملات میں انہیں بھی کوئی اختیار حاصل ہے کہ نہیں!" ــــ یہ بات ایمان کے بالکل منافی ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت غیر مشروط طور پر اور بلا چون وچرا کرنی ایمان کا لازمہ ہے: وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ "اور جو کچھ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں دیں اسے قبول کرو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دیں اس سے رُک جاؤ" ــــ اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح حکم آگیا: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○ " (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ کے رب کی قسم، یہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ لوگ اپنے ہر باہمی اختلاف میں آپ کو حَکَم نہ مان لیں، پھر جو بھی فیصلہ آپؐ کر دیں اُسے بے چون وچرا اور خوش دلی سے تسلیم نہ کریں، دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں" ــــ یہ حکم اطاعت رسولؐ کے ضمن میں نصِ قطعی ہے ــــ پس معلوم ہوا کہ ایمان مرکب ہے 'اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ' کا ــــ یہ دونوں اطاعتیں لازم وملزوم ہیں، لَابُدَّ مِنْهُ ہیں، لاینفک ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا ــــ تمدنی زندگی میں جتنی بھی اور اطاعتیں ہوں گی وہ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر اور ان کے تحت ہوں گی۔ جیسے اولوالامر کی اطاعت، والدین کی اطاعت، اساتذہ کی اطاعت وقس علیٰ ہذا۔ پس معلوم ہوا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مطلق ہے، غیر مشروط ہے، اور اس کی اصل بنیاد ایمان ہے۔

نظامِ بیعت: لیکن سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعہ سے یہ بات بھی بہت واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر مختلف کاموں کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بیعتیں لی ہیں۔ ان مختلف بیعتوں میں سے ایک بیعت کا بڑے مہتم بالشان طریق پر قرآن مجید میں بھی ذکر آیا ہے اور وہ بیعت، بیعتِ رضوان کے نام سے مشہور و معروف ہے: لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ "بالتحقیق اللہ ان مؤمنوں سے راضی ہوگیا جنہوں نے (اے نبی) آپؐ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کی تھی" ــــ یہ وہ بیعت ہے جو حدیبیہ کے مقام پر صلح سے قبل مکہ میں حضرتِ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کئے جانے کی خبر ملنے پر حضرتِ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینے کے لئے حضورؐ نے

صحابہ کرامؓ سے لی تھی۔ اسی بیعت کے متعلق اللہ تعالےٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا، کہ : اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ج ــــ " (اے نبیؐ) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ تھا " ــــ میں یہ بات دعوے سے کہا کرتا ہوں کہ جو چودہ سو صحابہ کرامؓ مدینہ سے حضورؐ کی معیت میں حدیبیہ پہنچے تھے، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا کہ اگر نبی اکرمؐ بیعت نہ لیتے ــــ جیسے احادیث میں بیعت علی الموت بھی کہا گیا ہے ــــ تو وہ پیٹھ دکھا دیتا ــــ ! وہاں اُلٹا معاملہ تھا۔ اس موقع پر جو صلح ہوئی ہے اُسے صحابہ کرامؓ کی طبیعت گوارا نہیں کر رہی تھی۔ اُن کے خون کھول رہے تھے، ان کی تلواریں نیام سے نکلنے کے لئے بے تاب تھیں۔ اُن کے دل ذوقِ شہادت سے مچل رہے تھے۔

قابلِ غور بات : اس بیعت کے ضمن میں انتہائی قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اس موقع پر بیعت کیوں لی! صحابہ کرامؓ کے تو ایمان کا تقاضا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابرو کے اشارے پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیں ــــ میرا استنباط یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیعت اس لئے لی کہ مابعد والوں کے لئے اپنی سنّت چھوڑ جائیں۔

حضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے مختلف کاموں کے لئے جو مختلف بیعتیں لی ہیں، ان کی حکمت بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ اجتماعیت کے قیام کے لئے بیعت کی سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مسلمانوں کے سامنے موجود رہے۔ جب کبھی ایسا وقت آجائے کہ اسلام بحیثیتِ دین قائم و نافذ نہ رہے۔ یعنی مسلمانوں کے نظامِ اجتماعی اور ان کی حکومت میں دین کے احکام، دین کے اوامر و نواہی، دین کی حدود و تعزیرات اور ایمان بالتوحید کے تین لوازم، تین COROLLARIES، تین تشریحات یعنی انسانی سطح پر کامل مساوات ــ انسان کی حاکمیتِ مطلقہ کی کامل نفی، اس کی جگہ نظریۂ خلافت اور ملکیتِ مطلقہ کی جگہ نظریۂ امانت ــــ فی الواقع اور بالقوّہ رائج اور نافذ نہ ہوں۔ تو جو لوگ اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے کمربستہ ہوں، ان کی ہیئتِ اجتماعیہ بیعت کے اصول پر وجود میں آئے اور قائم ہو۔

ایک متفق علیہ حدیث : اپنے اس استنباط کو مؤکد کرنے کے لئے میں آپ کے سامنے ایک متفق علیہ حدیث پیش کرتا ہوں ــــ اہلِ سنّت کا یہ متفقہ مؤقف ہے کہ جس حدیث پر ہمارے چوٹی کے دو محدثین یعنی امام بخاری اور امام مسلم رحمہا اللہ کا اتفاق ہو، احادیث میں اس سے بلند کسی حدیث کے پختہ ہونے کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ یقینی ہونے کے اعتبار سے ایسی حدیث قرآن مجید کے

ہم وزن مانی جاتی ہے۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرتِ عبادۃ بن الصامت رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت آئی ہے:

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ قَالَ بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔

"انہوں نے (حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے) کہا۔ ہم نے بیعت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر کہ سنیں گے اور مانیں گے چاہے تنگی ہو چاہے آسانی (مشکل ہو یا آسان) چاہے (طبیعت میں) نشاط و انبساط ہو چاہے طبیعت پر جبر کرنا پڑے۔ چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے اور اس بات پر کہ جو لوگ صاحبِ امر ہوں گے ہم ان سے کبھی جھگڑا نہیں کریں گے اور اس بات پر کہ ہم اللہ کے معاملہ میں حق کہتے رہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں اور ہم ہرگز نہیں ڈریں گے کسی ملامت گر کی ملامت سے۔"

یہ بیعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اہلِ یثرب (مدینہ والوں) سے لی تھی جو وادیٔ عقبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر مشرف باسلام ہو کر دولتِ ایمان سے شاد کام ہوئے تھے۔ سیرت مطہرہ میں اسے "بیعتِ عقبہ ثانیہ" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس بیعت کے لحاظ میں اس ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے پورا دستور و آئین موجود ہے جو اقامتِ دین، تکبیرِ رب، اظہارِ دینِ الحق اور اعلائے کلمۃ اللہ یعنی موجودہ دور کی اصطلاح کے مطابق اسلامی انقلاب کے لئے وجود میں آئے اور قائم ہو۔

غزوۂ احزاب میں صحابیہؓ کا ایک ترانہ

آپ کو معلوم ہے کہ ۵ھ میں قریش نے عرب کے مختلف قبائل اور یہود کے بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ مدینہ منورہ پر حملہ کے لئے کوچ کیا تھا تاکہ شمعِ توحید کو بجھا دیں۔ توحید کی انقلابی دعوت و تبلیغ اور جہاد و قتال کی تحریک کا خاتمہ کر دیں۔ عرب کی تاریخ میں اتنا بڑا لشکر شاید ہی کبھی مجتمع ہوا ہو۔ اس میں اس وقت کے قریباً تمام ہی جنگجو قبائل شامل تھے۔ قریش اور یہود تو آتشِ انتقام سے بھی جل رہے تھے۔ ان میں بڑا جوش و خروش تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب خبر ملی کہ یہ لشکرِ جرار مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آ رہا ہے تو آپؐ نے حضرت سلمانِ فارسیؓ کے مشورے سے مدینہ کے دفاع کے لئے اُس رُخ پر کہ جس طرف کوئی قدرتی

آڑ نہیں تھی اور جس سمت سے اس لشکر کے مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کا قوی امکان تھا، خندق کھودنے کا فیصلہ فرمایا۔ سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا میرا جو بھی حقیر مطالعہ ہے اس کی بنیاد پر میری رائے یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ذاتی طور پر سب سے سخت دن "یوم طائف" گزرا ہے اور اہلِ ایمان پر بحیثیت جماعت سب سے سخت اور شدید ایام "غزوۂ احزاب" کے گزرے ہیں۔ سخت سردی کا موسم تھا اور مدینہ کی زمین سخت سنگلاخ تھی۔ اس موقع پر جب صحابہ کرامؓ نبی اکرمؐ کی قیادت میں خندق کھود رہے تھے اور کدالیں چلا رہے تھے تو حال یہ تھا کہ کئی کئی دن فاقے میں گزرتے تھے۔ پیٹوں پر پتھر بندھے ہوئے ہوتے تھے کہ خالی پیٹ کے باعث کہیں کمر دُہری نہ ہو جائے۔ اس شدید مشقت کو آسان کرنے کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جرأتِ مومنانہ اور ہمتِ مردانہ کے ساتھ کدالیں چلاتے وقت کورس کے انداز میں کہتے جاتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ

"اے اللہ! آخرت کی زندگی اصل زندگی ہے، آخرت کا عیش اصل عیش ہے۔"

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں فرماتے تھے:

فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃَ

"(اے اللہ) پس مغفرت اور بخشش فرما دے انصار و مہاجرین کی (اس) جماعت کی۔"

صحابہ کرامؓ ترانہ کے طور پر یہ شعر بھی کثرت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی 'صحیح بخاری' میں روایت کر کے اُسے ہمیشہ ہمیش کے لئے محفوظ کر دیا ہے کہ:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

"ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے بیعت کی ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہ ہم جہاد کرتے رہیں گے ہمیشہ ہمیش (یعنی جب تک جسم و جان کا رشتہ باقی ہے)۔"

یہ دوسرا مرحلہ ہے تنظیم۔ یہ ہے حزب اللہ کی شان۔ یہ ہے صحابہ کرامؓ کی جماعت کی اعلیٰ ترین خصوصیت جس کی بنیاد بیعت ہے۔

داعیٔ انقلاب کا تاریخی ارشاد: آگے بڑھنے سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ تاریخی ارشاد بھی سن لیجئے جو حضورؐ نے انتیس دن کے محاصرے کے بعد اس لشکرِ جرار کے اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت کے باعث ناکام و خاسر ہو کر منتشر ہونے کے بعد فرمایا تھا کہ:

لَنْ تَغْزُوَكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُونَهُمْ

"اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکتے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔"

میرے نزدیک سورۃ الصف اسی موقع پر نازل ہوئی ہے جس میں یہ آیت مبارکہ موجود ہے:

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"اور (اے مسلمانو!) ایک دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے یعنی اللہ کی مدد ــــ تو وہ آیا چاہتی ہے اور اب فتح دور نہیں ہے (وہ تمہارے قدموں کو چومنے والی ہے) اور اے نبیؐ! اہلِ ایمان کو بشارت سنا دیجئے۔"

ایک اہم اصول: تنظیم کے متعلق یہ اہم اصول بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ انقلاب کے لئے سمع و طاعت والی تنظیم لازم ہے۔ لابدمنہ ہے۔ اس کے بغیر انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ ہجوم (MOB) یا متحدہ محاذ یا قومی اتحاد یا کسی سیاسی جماعت یا جماعتوں کی کسی اتحادی مہم سے اسلامی انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ ان ذرائع سے یا تو منفی کام ہو سکتے ہیں جس پر پاکستان کی ماضی قریب کی تاریخ شاہد ہے۔ یا حکمرانوں کے ہاتھ بدل سکتے ہیں۔ کاروبارِ حکومت میں کچھ اصلاحات بھی کی جا سکتی ہیں۔ لیکن جس چیز کا نام اسلامی انقلاب ہے جو رائج الوقت نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر توحید پر مبنی نظامِ عدل و قسط قائم و نافذ کرتا ہے، وہ برپا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تو ایسی تنظیم لازم ہے جو اقامتِ دین کے لئے سمع و طاعت کی بیعت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو۔

سمع و طاعت کا دوسرا درجہ: البتہ ایک اہم فرق کو ذہن نشین کر لیجئے۔ وہ یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مطلق ہے۔ اس لئے کہ رسول ہی تو درحقیقت امّہ کا نمائندہ ہے۔ لہٰذا رسولؐ کی اطاعت غیر مشروط ہے۔ البتہ بعد کے دور میں اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی تنظیم یا جماعت کے امیر کی اطاعت مشروط ہوگی بالمعروف کے ضابطہ اور قاعدہ کے ساتھ۔ مقیّد ہوگی الکتاب والسنّۃ سے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام کا جو دائرہ ہے اس کے اندر اندر ہر حکم کی اطاعت ہوگی۔ اس سے باہر ہو تو "لا سمع ولا طاعۃ" ہے۔ اس کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اٹل ضابطہ و قانون طے فرما دیا ہے کہ:

لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ

"کسی مخلوق کی (ایسی) اطاعت نہیں ہوگی جس سے خالق کی معصیت لازم آتی ہو۔"

صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اس سے مستثنیٰ ہے چونکہ فرمانِ الٰہی ہے جو میں شاید پہلے بھی آپ حضرات کو سنا چکا ہوں کہ : وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ؕ ۔

تیسرا مرحلہ ــــ تربیت و تزکیہ

اس کا تیسرا مرحلہ ہے تربیت و تزکیہ ــــ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے جو اس کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے :

؎ خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

اسی بات کو اقبال کے مرشدِ معنوی اکبر الٰہ آبادی نے نہایت سادہ لیکن دل نشین انداز میں یوں ادا کیا ہے ؎ تو خاک میں مِل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

آپ اگر ریت اور بالُو کے گولے بنا کر شیشے پر ماریں گے تو شیشے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ریت بکھر جائے گی اگولا کھیل کھیل ہو جائے گا۔ اسی ریت کو آگ میں تپا کر اس کا روڑا بنا کر شیشے پہ ماریئے تو کچھ نہ کچھ نتیجہ برآمد ہوگا۔ پختہ نہ ہو تو بے کار ہے۔ اسی لفظ پختہ کو اقبال فارسی کے ایک شعر میں لائے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے چوٹی کے اشعار میں سے ایک ہے ــــ علامہ مرحوم نے 'اسلامی انقلاب' کے فلسفے کو دو مصرعوں میں سمو دیا ہے۔

؎ بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

پہلے ریاضت ہے، مشقت ہے۔ تعبّدی امور کی بجا آوری ہے۔ اپنا تزکیہ ہے۔ اپنی تربیت ہے۔ روحانی اور اخلاقی منازل کو طے کرنا ہے ــــ توحید پر ایمان، رسالت پہ ایمان اور بعث بعد الموت پر ایمان کو دل و دماغ، فکر و نظر اور شعور و ادراک کی سطحوں پر نقش کالحجر بنانا ہے۔ قرآن حکیم کو اپنا امام و ہادی اور سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کو اپنا راہ نما و رہبر قرار دینا ہے۔ ان تمام کاموں کو علامہ نے پہلے مصرعے میں 'نشۂ درویشی' سے تعبیر کیا ــــ دوسرے مرحلے میں انقلاب کا فلسفہ

بیان کرتے ہیں کہ ان مراحل سے گزر کر جب پختہ ہو جاؤ تو اپنے آپ کو 'سلطنتِ جم' پر دے مارو۔ یہاں 'سلطنتِ جم' سے علامہ کی مراد ہے ہر نظامِ طاغوت اور ہر نظامِ باطل ـــــ علامہ اس شعر کی وساطت سے مسلمانوں کو سبق دے رہے ہیں کہ ذاتی تربیت، ذاتی تزکیہ، ذاتی اصلاح کا اصل مقصود و مطلوب اس کا حقیقی ہدف ہر طاغوتی اور ہر باطل قوت اور نظام سے تصادم اور ٹکراؤ ہے ـــــ یہ نہ ہو کہ ہمیشہ کے لئے خانقاہی نظام ہی وجود میں آجائے۔ اسی پر کفایت کرلی جائے۔ کسی خانقاہ میں بیٹھے اپنے آپ کو رگڑتے اور مانجھتے ہی رہو اور یہ بات یاد ہی نہ رہے کہ میدان میں آکر باطل کو للکارنا ہے، طاغوت سے پنجہ آزمائی کرنی ہے، دینِ حق کے غلبہ کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کے مقام پر ایک بندے کو فائز کرتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○ ـــــ علامہ نے اسی بات کو یوں ادا کیا ہے:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

تزکیہ و تربیت کا اصل مقصود ہے کہ خود کو تیار کرکے آگے کام کرنا ہے۔ یہ قوت فراہم کرکے اسلامی انقلاب لانا ہے ـــــ بغیر تیاری کے ـــــــــــــــــــــــ ٹکرانا بھی غلط اور ساری عمر تیاری میں لگے رہنا، اگلا قدم نہ اٹھانا بلکہ اس کا نگاہوں سے اوجھل ہو جانا بھی غلط۔ دونوں کام یکساں غلط۔ جیسے وضو ہی کرتے رہ جانا۔ نماز پڑھنے کا موقع ہی نہ آنے دینا۔ ـــــ اسی کو اقبال نے مثبت انداز میں کہا ہے اس شعر میں جو ابھی میں نے آپ کو سنایا کہ ؎

با نشۂ درویشی درساز و دمادم زن   چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

نوعیتِ تربیت: اس تربیت کے بارے میں یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ ہر انقلاب کی مناسبت سے تربیت کی ضرورت ہوگی۔ تربیت کی نوعیت اس نظام کے اعتبار سے معین ہوگی جو آپ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اشتراکی انقلاب لانا ہو تو روحانی اور اخلاقی تربیت میں وقت ضائع کرنا حماقت قرار پائے گی چونکہ اس انقلاب میں روحانی و اخلاقی اقدار (VALUES) سرے سے موجود ہی نہیں ہیں لہٰذا اشتراکی انقلاب کے علمبرداروں کو تقوے کا خوگر بنانا اور ان سے وہ ریاضتیں کرانا جو اسلامی انقلاب کیلئے ناگزیر اور لابدمنہ ہیں، اس انقلاب کے فلسفے کی رُو سے وقت کا زیاں ہے۔ ان کو یہ بتانا کہ عصمت و عفت اور پاک دامنی ایک اعلیٰ وارفع قدر ہے، حماقت ہے۔ ان کا نظریہ تو ہے کہ کامریڈ مرد اور کامریڈ عورتیں جس طرح چاہیں اس جذبے کی تسکین کرلیں۔ بلکہ شادی بیاہ تو مصیبت ہوگی،

گھر گرہستی تو وبالِ جان ہے۔ اس میں پھنس گئے تو انقلابی کہاں رہ جائیں گے! لہٰذا وہ اس کی مخالفت کریں گے۔ البتہ انقلاب آجائے تو کسی ایک سے وابستہ ہونے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے ـــــ یہ بات پلّے باندھ لیجئے کہ ہر کام کا اپنا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ یہ بالکل سیدھی سادی منطق ہے۔ اس لئے اشتراکی کارکنوں کے لئے روحانیت اور اخلاق ایک بے قدر شے ہے۔ ان کے نزدیک اس کے معیارات بدلتے رہتے ہیں اور ان کے نزدیک ان کو مستقل اقدار قرار دینا بورژوائی متھکنڈا اور سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ جبکہ اسلام میں INSTITUTION OF MARRIAGE کو " اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ " قرار دیا گیا ہے۔ اور یہاں تک فرما دیا گیا ہے : وَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ ـ " اور جس کسی کو میری سنّت میں سے کوئی سنّت پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں " (فرمانِ رسول)۔ اگر روحانیت، اخلاق اور عصمت کا معاملہ نہیں ہے تو اسلامی انقلاب کی طرف پیش قدمی کا کیا سوال!

مطلوبہ اوصاف : اسلامی انقلاب کے کارکنوں میں تو وہ کیفیت مطلوب ہے جس کی مختصر لیکن جامع ترین الفاظ میں تصویر کشی کی تھی ایرانی جاسوسوں نے ـــــ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے دورِ خلافت میں جب ایران کے ساتھ جنگیں ہو رہی تھیں تو رستم سپہ سالارِ افواجِ ایرانی نے کچھ جاسوس بھیجے کہ ذرا ان مسلمانوں کی فوج کے حالات دیکھ کر آؤ کہ ان کے حوصلوں کی کیفیت کیا ہے! ان جاسوسوں نے آکر جو رپورٹ دی ہے اس کا ایک جملہ میری پوری بات کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ جاسوسوں نے مسلمانوں کی فوج کا نقشہ ان الفاظ میں بیان کیا :

هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّیْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ

" (وہ عجیب لوگ ہیں) وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار ہیں "۔

دنیا میں پہلے راہب بھی تھے، شہسوار بھی تھے لیکن دونوں علاحدہ علاحدہ تھے جو رات کا راہب وہ دن میں بھی راہب ـــــ اور جو دن میں شہسوار ہے اس کی رات کسی اور رنگ میں گزرتی تھی۔ جہاں کسی فوج کا پڑاؤ ہو جائے وہاں آس پاس کی کسی عورت کی عصمت محفوظ رہ سکتی تھی؟ وہاں شراب نوشیوں، عیاشیوں اور رنگ رلیوں کے سوا اور کسی چیز کا بازار گرم ہو سکتا تھا؟ ـــــ اس زمانے میں بھی فوجوں کا کم و بیش یہی حال ہے ـــــ اُس دور میں سلطنتِ کسریٰ اور سلطنتِ روما کی لاکھوں کی تعداد میں STANDING ARMIES ہوا کرتی تھیں۔ پس دنیا میں راہب بھی تھے اور فوجیں بھی تھیں۔ لیکن ان دونوں متضاد کیفیات کا شخصیتوں میں یکجا (COMBINE) کر دینا۔ یہ ہے کمال دنیا

کے عظیم ترین انقلابی داعی جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تزکیۂ نفس کا ۔ دشمن کے جاسوس بھی گواہی دے رہے ہیں کہ 'هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ' ۔ جہاں ان کی فوجوں کا پڑاؤ ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ راہب خانہ ہے ۔ کوئی سجدے میں پڑا ہے اور بارگاہِ ربّ میں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہا ہے ۔ سجدہ گاہ آنسوؤں سے بھیگ گئی ہے ۔ کوئی ہاتھ باندھے حالتِ قیام اپنے خالق و مالک کے حضور کھڑا ہے اور گڑگڑا رہا ہے ۔ اُس کے آنسوؤں سے جھڑی سے داڑھی تر ہو گئی ہے ۔ کہیں شراب نوشی نہیں، کہیں کوئی عیاشی نہیں، کوئی بدمعاشی نہیں، کسی قسم کے رنگ رلیاں نہیں ۔ فوجوں کا کیمپ راہب خانے کا نقشہ پیش کر رہا ہے ـــــ اور یہی لوگ دن میں جب گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہیں، ہاتھوں میں تلواریں ہیں، نیزے ہیں اور دشمن کی فوجوں پر بجلیوں کی طرح لپکتے ہیں، تلواریں کوندتی ہیں اور ایک ایک سپاہی بیسیوں دشمنوں پر بھاری پڑتا ہے اور ان کی ہمت و جرأت سے دشمن مبہوت و مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے ۔

اجتماعِ ضدّین : غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہی بات مسٹر ہارٹ نے ایک دوسرے اسلوب سے کہی ہے ۔ ظاہر بات ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ۔ پھر پھل کو آپ درخت کے حوالے سے جانتے ہیں ۔ درخت آم کا ہے تو آم لگے گا ۔ درخت نیم کا ہے تو اس میں نبولی لگے گی ۔ اس جوہر کو جو جنابِ محمد میں تھا، صلی اللہ علیہ وسلم ـــ مسٹر ہارٹ نے ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے :

"HE IS THE ONLY PERSON SUPREMELY SUCCESSFUL IN BOTH THE RELIGIOUS AND THE SECULAR FIELDS."

یہی اجتماعِ ضدّین جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اصحاب میں ہے، رضوان اللہ علیہم اجمعین ۔ جس کو ایرانی جاسوسوں نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ 'هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ' ۔

پس یہ ہیں تین ابتدائی یا تمہیدی مراحل ـــ ان میں سے کسی میں بھی کچا پن رہ جائے تو ظاہر بات ہے کہ اگلا جو قدم بھی اٹھے گا اس میں ناکامی ہوگی ۔ یہ ہر انقلاب کی اوّلین اساسی و بنیادی شرائط ہیں ۔ اگر نظریے کی صحیح تعبیر نہیں ہوتی ہے تو محض ایک 'وعظ' ہے ۔ اس کے نتیجہ میں انقلابی عمل شروع ہوگا ہی نہیں ۔ اگر سمع و طاعت والی تنظیم وجود میں نہیں آئی ہے تو انقلابی عمل آگے نہیں بڑھ سکے گا ۔ تربیت نہیں ہوئی ہے، سیرت و کردار کی پختگی نہیں ہے تو کسی نہ کسی مرحلہ میں یہ تنظیم کچے ریت کے گولے

کی طرح بکھر جائے گی ۔ یہ ہیں تین ابتدائی یا تمہیدی مراحل ۔ پہلا انقلابی نظریہ اور اس کی دعوت و تبلیغ ۔ دوسرا قبول کرنے والوں کی تنظیم اور تیسرا ان کی تربیت ۔

ایک ضروری وضاحت: دنیا کے جو دو انقلابات مشہور ہیں یعنی انقلاب فرانس اور انقلاب روس ۔ تو ان انقلابات کی اساسات چند ذہین وفطین انسانوں کے غور و فکر پر قائم اور مبنی ہیں۔ اسی لئے ان کو 'نظریہ' یا IDEALOGY کہنا درست ہے ۔ جب کہ اسلام معاذ اللہ کسی انسان کے فکر اور اس کے غور و خوض کا نتیجہ نہیں ہے ۔ بلکہ یہ دینُ اللہ ہے ۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ؕ یہ خالق و مالکِ ارض و سماوات کا نازل کردہ کامل نظامِ حیات ہے جو انبیاء و رسل علیہم السلام کی وساطت سے نوعِ انسانی کو دیا گیا ہے ۔ اس کی بنیاد کوئی انسانی نظریہ (IDEALOGY) نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقی اساس ایمان باللہ ہے ۔ اس کا عمل میں ظہور عبادتِ ربّ ہے ۔ یعنی پوری زندگی کو انسان اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اسی کی پرستش کے لئے وقف کردے ۔ جیسے سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ اپنی ذاتِ اقدس کے تعارف کے لئے فرماتا ہے: اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۔ "مَیں ہی اللہ (معبودِ برحق) ہوں ۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں (کوئی بندگی اور پرستش کے لائق نہیں) پس صرف میری ہی عبادت کیا کرو ۔" اور سورۂ بقرہ میں فرمایا: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ ۔ "اے لوگو! بندگی اور پرستش کرو اپنے ربّ کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو جو تم سے پہلے تھے "۔ سورۂ اخلاص میں داعئ انقلاب کو حکم ہوا: قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰہُ الصَّمَدُ " (اے نبیؐ! لوگوں سے) کہدیجئے کہ وہ اللہ یکتا ہے ۔ اللہ سب سے بے نیاز (اور وہی سب کا پشت پناہ) ہے"۔ دورانِ تقریر میں اگر میں نے دینِ اسلام کے لئے 'نظریہ' یا IDEALOGY کا لفظ استعمال کیا ہے تو وہ بغرضِ ابلاغ و تفہیم استعمال کیا ہے ۔ درحقیقت ہمارا دین منزل من اللہ ہے ۔

(جاری ہے)

عَنِ الحَارِثِ الاشعری، قَالَ، قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

"اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ ۵

بِالجَمَاعَةِ ۱ وَالسَّمعِ ۲ وَالطَّاعَةِ ۳ وَالھِجْرَةِ ۴ وَالجِھَادِ ۵ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہ

قافلۂ انقلابِ اسلامی، منزل بمنزل

الاخوان المسلمون

قاضی ظفر الحق

تحریک کا پس منظر.....

تحریکوں کا مطالعہ کرنے والا کوئی عام اور ادنیٰ قاری بھی اس کلیہ سے نا آشنا نہیں رہ سکتا کہ تحریکیں حالاتِ زمانہ کے ردِّ عمل میں ابھرتی اور پھر ان ہی کا شکار ہو جاتی یا انہیں بدل دیتی ہیں۔ یہ قاعدہ اتنا عام ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تحریکیں بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دی جا سکتیں۔ چنانچہ حالاتِ زمانہ کی ابتری اور نوعِ انسانی کا اخلاقی دیوالیہ پن ہی رحمتِ الٰہی کو جوش میں لاتا اور اس طرح نبوت کے اجراء کا سبب بنتا تھا۔ البتہ نبوی اور غیر نبوی تحریک میں ایک نہایت واضح اور اثرات کے اعتبار سے بڑا عظیم فرق یہ ہوتا ہے کہ نبوی تحریک اس خطرہ سے بالکل محفوظ ہوتی تھی کہ نبی خود ردِّ عمل کی نفسیات کا شکار ہو جائے یا اس کی تحریک میں ابتداء ہی سے عدم توازن کی خطرناک بیماری پائی جائے، جبکہ کسی غیر نبی کا ردِّ عمل کی نفسیات اور اس کی تحریک کا عدم توازن سے محفوظ رہنا نہایت مشکل بلکہ اکثر ناممکن ہوتا ہے۔

چنانچہ کسی تحریک کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس پس منظر کا تفصیلی جائزہ لیا جائے، جس میں وہ تحریک جنم پذیر ہوئی ہے۔ ان عوامل کا بغور مطالعہ کیا جائے، جو اس پر اثر انداز ہوئے اور جنہوں نے اس کے پروان چڑھنے میں کوئی مثبت یا منفی کردار ادا کیا۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس کی آفرینش اور ارتقاء کے دوران آس پاس کا ماحول کیسا رہا اور اس کے بانیوں کی شخصیات کو بھی اس ضمن میں خصوصی مطالعہ کا حقدار سمجھنا چاہئے۔

بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی کے مصر پر ایک نظر

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو مصر بھی دیگر اسلامی خطوں کی طرح ایک غلام اور محکوم ملک تھا۔ برطانیہ عظمیٰ کے پنجے مصر کے ناتواں جسم میں گہرائی تک گڑے ہوئے تھے اور مکّار و سفّاک انگریز حسب معمول اس کا سیاسی و معاشی استحصال کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بسنے والے مسلم معاشرہ کا تعلیمی اور معاشرتی و اخلاقی قتل عام کر رہا تھا۔ انگریز حکمرانوں کی شدید خواہش تھی کہ مصری قوم اسلام سے اپنا رشتہ ناطہ توڑ کر تہذیبی اور ثقافتی سطح پر بھی مغرب کی مکمل غلامی اختیار کر لے۔ چنانچہ ایک طرف تو ہر وہ گلا گھونٹ دیا جاتا تھا' جس میں سے آزادی کا نعرہ نکلے۔ ہر وہ تحریک کچل دی جاتی تھی' جو آزادی کا نام لے کر چلے۔ اور دوسری طرف عیسائی مبلّغین نے مصر پہ یلغار عام کر رکھی تھی' جنہیں سرکاری سطح پر زبردست سرپرستی حاصل تھی۔ آزادئ صحافت اور آزادئ نسواں کے دلفریب نعروں کے پس پردہ اباحیت' لادینیت' عریانی و فحاشی اور ریب و تشکیک اور غلامی کی فضیلت جیسے گمراہ کن ابلیسی منصوبوں پر کام ہو رہا تھا۔ مسلّمہ اسلامی قدروں کو پامال کرنے کی رغبت دلائی جا رہی تھی اور مسلمانوں کی ساری پستی کا واحد سبب (معاذ اللہ) اسلام کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔

برطانوی دورِ اقتدار میں جدید نظامِ تعلیم سے اسلامی اصولوں کو اس طرح بے دخل کر دیا گیا تھا کہ اسلام خود اپنے بیٹوں کے لئے اجنبی بن گیا تھا۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کا زرّیں مغربی اصول مصر میں بھی اپنے شگوفے کھلا رہا تھا اور انگریز حکومت مصر میں اقلیتوں کی نہایت ڈھٹائی سے سرپرستی کر رہی اور انہیں مسلمانوں پر مسلّط کر رہی تھی۔ مصری قوم میں فراعنۂ مصر کی اولاد ہونے کا فخر ابھارا جا رہا تھا اور قبطی فینیقی اور عرب و ترک کی منافرت پروان چڑھائی جا رہی تھی۔

مصر کے سوچنے سمجھنے والے ذہن بھی اسی طرح جس طرح کہ ہندوستان کے مسلمان ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ کے بعد دستوری ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے' ۱۸۸۲ء کی اعرابی پاشا کی ناکام بغاوت کے بعد مسلح جدّوجہد کا خیال ترک کر بیٹھے تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں دستوری ذرائع سے مصر کی آزادی کا پرچم اور نعرہ لے کر ایک طرف مصطفیٰ کامل کی "الحزب الوطنی" میدان میں آئی تو دوسری طرف مفتی محمد عبدہٗ کی "الحزب الوطنی الحر" بھی میدان میں اتر آئی' جس کی قیادت لطفی السید کے پاس تھی اور ایک تیسرا گروہ مصری وطنیت کی

علمبرداری کرتے ہوئے ۱۹۰۷ء میں "حزب الامۃ" کے نام سے وجود میں آیا، جس کی تاسیس کا سہرا محمود سلیمان پاشا کے سر ہے۔

یہ تین گروہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اصلاً دو بنتے ہیں یعنی مصطفیٰ کامل کی الحزب الوطنی جو مصر کی آزادی اور اس کے اسلامی کردار کی بحالی کے ساتھ ساتھ ایک ملتِ واحدہ کا حصہ ہونے پر یقین رکھتی تھی اس پر جذبات اور جوش کا غلبہ تھا۔ جبکہ دوسرا گروہ یعنی الحزب الوطنی الحر اور حزب الامۃ جو مصر پر انگریز کے قبضہ کو نعمتِ خداوندی قرار دیتا تھا اور مصر کو مغربیت میں بالکل رنگ دینا چاہتا تھا اور اس کے عربی یا اسلامی کردار سے نفور تھا۔ اس گروہ نے دلیل اور دھیما پن اپنا شعار بنا لیا تھا اور اس لئے نوجوانوں میں اس کا اثر و نفوذ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ دراصل اسلامی قومیت اور مصری قومیت کی دو تحریکیں تھیں، جن کے مابین انگریز اور مقامی قبطی عیسائی درپردہ نفرت کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔ یہ نفرت کی آگ اس وقت نہایت بلند ہو گئی، جب ۱۹۰۹ء میں بطرس غالی مصر کا وزیر اعظم بنا اور اس نے پے در پے ایسے اقدام کئے جنہوں نے اہالیانِ مصر کا دل پارہ پارہ کر دیا چنانچہ الحزب الوطنی کے ایک کارکن نے ۱۹۱۱ء میں بطرس کو گولی مار کے ہلاک کر دیا، جس کے نتیجہ میں مصر ایک بڑی خانہ جنگی کا شکار ہو گیا اور اخبارات سے نکل کر جنگ گلی کوچوں میں پھیل گئی۔

اس خانہ جنگی نے مصری قوم پر بڑے گہرے اثرات ڈالے چنانچہ مصری معاشرہ میں پائے جانے والے نسلی و لسانی اور قدیم و جدید تعلیم یافتہ طبقات میں وسیع خلیج اور اونچی دیوار حائل ہو گئی۔

آزاد مصر

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جب امریکی صدر ولسن نے چھوٹی قوموں کے حق خود اختیاری کا اعلان کیا تو مصر میں بھی آزادی کا مطالبہ زور پکڑ گیا چنانچہ سعد زغلول پاشا کی سرکردگی میں ایک وفد ۱۹۱۸ء میں تشکیل دیا گیا، جس نے امن کانفرنس پیرس اور لندن میں مصر کا معاملہ پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا یہ وفد "وفد المصری" کے نام سے مشہور ہوا۔ اسے لندن جانے کی اجازت نہ ملی بلکہ سعد زغلول کو مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی، جسے گو بہت سختی سے کچل دیا گیا مگر مصر کے حالات اتنے دگرگوں ہو گئے اور سعد زغلول کی وفد پارٹی کا برطانوی اشیاء سے مقاطعہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ حکومتِ

برطانیہ نے سعد زغلول اور دیگر وفدی رہنماؤں کو گرفتار کر کے جزیرۂ سچلس بھیج دیا مگر اس تحریک کا زور کم نہ ہوا اور بالآخر برطانیہ نے یک طرفہ طور پر ۱۹۲۲ء میں مصر کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ سعد زغلول وطن لوٹے اور ۱۹۲۳ء میں انتخابات جیت کر ان کی وفد پارٹی نے حکومت بنائی اور وہ خود وزیر اعظم بنے جبکہ ملک کی آئینی سربراہی شاہ فواد کے پاس تھی۔

مصر اگرچہ آزاد ہو چکا تھا مگر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے برطانوی اقتدار کی بہت سی لعنتوں کا وراثتاً امین بھی بن چکا تھا۔ چنانچہ تحقیق و اجتہاد کے نام پر شعراء اور ادیبوں کا ایک گروہ اسلام سے نوجوان نسل کو برگشتہ کر رہا تھا اور انہیں مغرب کی نقالی کے فضائل سے روشناس کرا رہا تھا تو ایک دوسرا گروہ ان میں نسلی و لسانی تفریق ابھار کر انہیں امتِ مسلمہ اور عالم عربی سے کاٹ رہا تھا۔ آزادئ صحافت کا نعرہ اگر یہ گل کھلا رہا تھا تو شخصی آزادی کا حسین خواب گھر گھر، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں شراب خانوں، جوا خانوں، بازارِ گناہ اور ریس کورسوں اور کلبوں کی صورت میں اپنی تعبیر حاصل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ آزادئ نسواں کا فتنہ (جس کی قیادت اولاً قاسم امین کے ہاتھ میں تھی پھر سعد زغلول کی بیوی صفیہ زغلول اور ہدی شعراوی کے ہاتھ میں آ گئی)، اس زور سے اٹھا کہ ہر باضمیر آدمی چیخ کے رہ گیا۔ مصری عورت کے ہاتھ اور چہرہ ہی نہیں سینہ اور پنڈلیاں بھی عریاں اور بے حجاب ہو گئیں۔ یہ طوفان بھی اخبارات اور خواتین کے اجتماعات کی مدد سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ داستانِ الم کا ایک باب اور بھی ہے، جس میں قدیم عربی کے خاتمہ کی کوششیں اور اسلامی علوم کے محافظ و امین طبقہ کی پستی و بدحالی اور غربت و اجنبیت کا دل فگار عنوان سرِلوح ثبت نظر آتا ہے۔

طٰہٰ حسین اور اس کی ذرّیت کی یہ بھرپور کوشش تھی کہ قرآن اور حدیث سے مسلمان کا ناطہ توڑنے کے لئے اس کو قدیم عربی لٹریچر سے محروم کر دیا جائے اور عربی زبان کے اصول اس طرح بدل دیئے جائیں کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہ جا سکے۔ طٰہٰ کی "فی الشعر الجاھلی" اسی تمنا کا ثمر ہے۔

اس کے علاوہ دین کے عالموں کو ذلیل و رسوا کرنے اور انہیں ترقی کی راہ کا روڑا ثابت کرنے کی ایک مسلسل تحریک زبان و قلم سے جاری تھی، جس کا مقصد مصر کے اجتماعی معاملات سے اسلام اور اسلامی اصولوں کی بے دخلی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

یہ وہ حالات تھے، جن میں بیسویں صدی کے ایک عظیم داعی نے جنم لیا اور عربوں میں ایک بے مثل تحریک بپا کر کے اسلام کا عالمِ عربی میں مستقبل محفوظ کر دیا۔ گو کہ آج بھی

کشاکش جاری ہے اور ظلم و ستم کی چکی مظلوموں کو نہایت قوت سے پیس رہی ہے، مگر لسانِ نبوی کی اٹل بشارت فتح و نصرت کی جاں فزا منزل دکھا چکی ہے۔ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

سپیدۂ سحر کی نمود

کچھ داعیٔ تحریک کے بارے میں

ظلمت کدۂ مصر میں جب گناہ اور عصیان اور اپنے رب سے دوری و مہجوری کی گھٹاٹوپ تاریکیاں ایک کے اوپر ایک چڑھی چلی آ رہی تھیں تو یکایک روشنی کے متلاشی اور شفق و فجور سے نالاں پسے ہوئے اور دبکے ہوئے اہل اللہ کی دعائیں بارگاہِ الٰہی میں مقبولیت و توجہ کی مستحق قرار پا گئیں اور محمودیہ کی بستی میں امام و خطیب اور متقی و مصنف باپ کے گھر مصر کا چاند طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روشن جبین کا اجالا تاریکیوں کے لئے ہلاکت کا پیامبر بن گیا۔

خاندان..... امام حسن البنّاء کا خاندان درویش صفت اور متدین افراد کا گھرانہ تھا۔ امام صاحب کے والد احمد عبدالرحمٰن البنّاء، جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل عالم اور ایک بے نفس انسان تھے۔ احمد عبدالرحمٰن کے والد عبدالرحمٰن ایک گاؤں شمشیرہ کے ساکن تھے اور ان کے پاس زمین کا کافی حصہ موجود تھا۔ احمد جب جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کرتے تھے تو اسی زمانہ میں ان کے بھائی محمد زمین کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد جب زمین کے محلِ نزاع بننے کا اندیشہ پیدا ہوا تو احمد فوراً اپنے بھائی کے حق میں کل زمین سے دستبردار ہو گئے اور محمودیہ چلے آئے۔ شیخ احمد اپنی روزی گھڑی سازی کے ذریعہ کماتے اور فارغ اوقات میں فقہ و حدیث کے مطالعہ میں منہمک ہو جاتے یا پھر آس پاس بسنے والے فلاحین (کاشتکاروں) کو قرآن حکیم سے روشناس کراتے۔ ان کے اسی تقویٰ، للّٰہیت اور علم دوستی کا نتیجہ تھا کہ محمودیہ کی جامع مسجد میں باصرار امامت و خطابت کی ذمہ داریاں انہیں سونپی گئیں۔ احمد عبدالرحمٰن البناء نے دو شادیاں کیں، جن میں سے پہلی بیوی سے سات اولادیں یعنی حسن البناء، عبدالرحمٰن البناء، فاطمہ، محمد البناء، عبدالباسط البناء، جمال البناء اور فوزیہ پیدا ہوئیں۔ جبکہ دوسری بیوی کی ایک ہی اولاد یعنی فریدہ ہوئی۔ آپ کی کئی تصانیف آپ کی شہرت کو دائمی بناتی ہیں۔

مختصر سوانح ..... حسن البنّاء شہید اکتوبر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت محمودیہ میں آپ کے والد اور آپ کے مشفق استاذ اور والد کے گہرے دوست' استاذ محمد زہران رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسۃ الرشاد الدینیۃ میں' ان کے پاک ہاتھوں میں ہوئی۔ حسن البنّاء نے قرآن حفظ کیا پھر فقہ' حدیث اور تفسیر کی تعلیم کے ساتھ ساتھ پرائمری اور مڈل کا امتحان پاس کیا۔ شہید استاذ نے دَمنہور ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں ۱۴ سال کی عمر میں داخلہ لیا اور سہ سالہ کورس مکمل کر کے قاہرہ کے دار العلوم (بعدہٗ قاہرہ یونیورسٹی) میں ایڈمشن لے لیا۔ اب ان کا خاندان بھی قاہرہ آ گیا۔ پھر استاذ نے ۱۹۲۷ء میں دار العلوم سے معلّمی کا ڈپلومہ لیا اور محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ استاذ شہید کو اسماعیلیہ میں معلّمی کے فرائض سونپ دیئے گئے۔ چنانچہ استاذ دن میں بچوں کی اسلامی تربیت اور رات میں ان کے والدین کی صحیح مشورت اور صراطِ مستقیم کی طرف لوگوں کو بلانے کے لئے یکسو ہو گئے۔ اسماعیلیہ ہی میں انہیں الاخوان المسلمون کی تاسیس کا لافانی شرف حاصل ہوا۔ چھ سال اسماعیلیہ میں دعوت و تنظیم کا اساسی کام کرنے کے بعد' استاذ قاہرہ منتقل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے دعوتی مصروفیات کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے کارِ معلّمی ترک کر دیا اور فنافی الدّعوت کے مرحلہ میں داخل ہو گئے۔

الاخوان المسلمون کی تاسیس مارچ ۱۹۲۸ء کو اسماعیلیہ میں ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چھ افراد کا یہ قافلہ چھ ہزار افراد کے لشکر میں بدل گیا۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں جب امام قاہرہ منتقل ہوئے تو تنظیم کی شاخیں پورے ملک میں قائم ہو چکی تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں حسن البنّاء نے تمام اسلامی ممالک کو نظامِ اجتماعی میں کلی اور اسلامی تبدیلی برپا کرنے کی دعوت دی۔ اس سلسلہ میں ان کی تحریریں بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں اخوان نے انگریزی استعمار کے خلاف زبردست تحریک چلائی۔ ۱۹۴۶ء میں ہی انہوں نے "الاخوان" نامی روزنامہ جاری کیا اور امام شہید کو تاحیات سربراہ بنا کر ان سے بیعت کی۔ الاخوان المسلمون کی بڑھتی ہوئی طاقت اور مصری معاشرہ کے تیزی سے دینی رجحان اختیار کرنے نے انگریزوں اور یہودیوں کی راتوں کی نیندیں حرام کر دیں' جس کے نتیجہ میں انہوں نے مصری حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ الاخوان المسلمون کو غیر قانونی قرار دے دے۔ مصری حکومت اس دباؤ کا سامنا نہ کر سکی اور عین اس وقت جب اخوانی رضا کار فلسطین میں یہودیوں کو ناکوں چنے چبوا رہے تھے' مصری حکومت نے پیچھے سے وار کر کے ۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اخوان کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ املاک ضبط کر لیں' کارکن

جیلوں میں ڈال دیئے اور بالآخر ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء کو وہ چراغ بھی گل کر دیا' جس کی روشنی ان کی تاریکیوں کے لئے پیامِ موت بن رہی تھی۔ رِمَنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا۔

امام البناء نے اسماعیلیہ کے زمانۂ قیام میں ہی اپنا گھر آباد کر لیا تھا اور اسماعیلیہ کے ایک اہل اللہ گھرانہ میں نکاح کیا تھا۔ وہ خاتون ایسی پیکرِ صدق و وفا اور صابر و شاکر وجود تھیں کہ حسن البناء شہید کے لئے ان کا انتخاب ایک آسمانی فیصلہ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ البناء کی چھ اولادیں ہوئی ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں۔ لڑکیوں کے نام سناء' وفا' رجا' ہاجرہ اور استشہاد ہیں۔ استشہاد کی پیدائش باپ کی شہادت کے دن کی ہے اسی نسبت سے اس کا نام استشہاد رکھا گیا۔ لڑکے کا نام سیف الاسلام ہے اور صورت و سیرت ہی نہیں مصائب کے منجدھار میں پھنسے ہونے کا تر کہ بھی اس نے وافر پایا ہے۔

حسن البناء کی شخصیت کا ارتقاء..... حسن البناء کے خاندان کے تذکرہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ان کے والد نہایت متقی و متدیّن عالم تھے۔ انہوں نے باوجود تنگ دستی اور عسرت کے محمودیہ کی جامع مسجد کی امامت اور خطابت کی ذمہ داریاں فی سبیل اللہ ادا کیں۔ وہ حدیث اور دیگر علومِ اسلامیہ کے ماہر تھے اور ان کی کتابوں میں امام احمدؒ کی مسند کی فقہی ترتیب اور پھر اس کی نہایت عالمانہ اور فاضلانہ شرح' جس نے مصر سے باہر بھی اہل علم کے حلقوں سے تحسین وصول کی' شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کے لئے ایک گھریلو نصاب مرتب کیا تھا' جس میں صرف و نحو' فقہ' اصولِ فقہ' حدیث اور سیرۃ کے علاوہ عمدہ تفسیری مواد بھی شامل تھا۔ وہ یہ نصاب اپنے بچوں کو زبانی یاد کرواتے اور اس طرح ان کی تعلیم و تربیت غیر محسوس طور پر ان کے بچوں کے باطن میں تقویٰ اور پاکیزگی کے جوہر بناتی چلی جاتی تھی۔ آپ کے والد کا قول تھا کہ "من حفظ المتون حاز الفنون"۔ جس نے متن حفظ کر لیا وہ فن پر حاوی ہو گیا چنانچہ وہ حفظ پر نہایت توجہ دیتے تھے۔ اس چیز نے بعد میں خطیب اور واعظ حسن البنّاء کی زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

علم و تقویٰ سے مملو گھر کی اس پاکیزہ فضا سے پیدا ہونے والے اثرات و جذبات پر شیخ محمد زہران علیہ الرحمتہ کے قرب و نگہداشت نے وہ کام کیا جو کہ سونے پر سہاگہ کرتا ہے۔ شیخ زہران اپنے ذہین اور پاک نفس شاگرد سے نہایت محبت و شفقت سے پیش آتے اور مکتب

عشق کے معروف دستور کے مطابق امام البناء کو زیادہ سے زیادہ اپنی صحبت میں مصروف رکھتے۔ شیخ زہران نابینا تھے مگر صرف سر کی آنکھوں سے ان کا قلب مومنانہ بصیرت کا خزینہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہونہار طالب علم کی صفات کو خوب جان بوجھ لیا تھا اور وہ دن رات ان ملکوتی صفات کی تجلی میں اضافہ کے لئے کوشاں رہتے۔ چنانچہ حسن البناء ان کے ساتھ اکابر کی علمی محافل میں کانوں اور مدرسہ میں عصا اور کتب خانہ میں آنکھوں کی حیثیت سے موجود رہتے۔ استاذ و شاگرد کے اس تعلقِ خاطر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب شیخ زہران مدرسۃ الرشاد الدینیۃ کی نظامت سے فارغ ہوئے تو شاگرد کو اس مدرسہ کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑنے لگے اور انہوں نے والد گرامی سے صاف صاف اس مدرسہ میں جانے سے انکار کر دیا۔ حسن البنّاء نے شیخ زہران سے کونسی لافانی دولت حاصل کی یہ انہی کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں:

"میرا یہ بھی اندازہ ہے کہ میں نے روحانی جذبہ کے ساتھ ساتھ استاذ رحمہ اللہ سے ذوقِ تحقیق اور کثرتِ مطالعہ کا شوق بھی اخذ کیا ہے"۔

("حسن البناء کی ڈائری" مترجم خلیل حامدی)

حسن البنّاء شہید کی عبقری شخصیت کو بچپن میں ہی ہم دو انجمنوں کا روحِ رواں دیکھتے ہیں۔ پہلی انجمن مدرسہ رشاد کے ایک خلیق و کریم استاذ احمد افندی عبدالخالق کی مجوّزہ تھی، جس کا کام طلبا کے اخلاق کی اصلاح کرنا اور انہیں نظمِ مدرسہ اور فرائضِ دینی کی پابندی پر آمادہ کرنا تھا۔ حسن البنّاء کے بچپن میں اس انجمن کی تشکیل نے، جواں عمری میں برپا کی گئی تحریک کے لئے، ایک اساسی اینٹ فراہم کی اور حسن البناء اعلیٰ اخلاقیات کے پیکر و داعی بن گئے۔ اس انجمن کی افادیت کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نوعیت کی انجمن، اصلاحِ اخلاق کے معاملہ میں وہ نتائج پیدا کر سکتی ہے، جو بیسیوں نظری وعظوں سے بھی پیدا نہیں ہو سکتے"۔

(حوالہ مذکورہ بالا)

دوسری انجمن جمعیت منع المحرّمات تھی، جس کا کام مدرسہ کی حدود سے باہر بسنے والوں کو غیر شرعی اور نامناسب کاموں سے روکنا تھا۔ وہ یہ کام خطوں کے ذریعہ کرتے تھے اور اس کام کا پھیلاؤ اور نظم اتنی مضبوطی حاصل کر گیا کہ لوگ کھلے عام منکرات کے صدور سے اجتناب کرنے لگے اور اس بات سے خوفزدہ رہنے لگے کہ کب انہیں سرزنش آمیز خط موصول ہو جائے۔

غرض حسن البنّاء کی شعور کی پختگی سے پہلے ہی مشیّتِ ایزدی وہ سامان مہیا کر چکی تھی جو کہ ایک عظیم داعی اور قائد کی زادِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

روحانی تربیت..... شیخ حسن البناء کی روح میں درد و غم اور الٰہیت و للّٰہیت اور گرمی و جوش و خروش محمودیہ کے ایک صوفی گروہ سلسلۂ حصافیہ کا پیدا کردہ تھا۔ اس سلسلہ کے لوگ اسکول سے ملحقہ مسجد صغیر میں بعد از نماز عشاء جمع ہو جاتے اور اللہ کے ذکر میں غرق ہو جاتے۔ شیخ کو ان کے اس شبینہ پروگرام ذکر و فکر نے بہت اپیل کیا اور وہ اس میں باقاعدگی سے شامل ہونے لگے ان صوفیوں کی وسیع الظرفی، تواضع اور متلاطم روحانیت نے حسن البناء کے ننھے سے دل کو اپنی مٹھی میں لے لیا اور حسن البناء حصافی شیخ کے دیدار کے لئے بے تاب رہنے لگے۔ وہ ان کا خاص وظیفہ باقاعدگی سے پڑھنے لگے اور ایک حصافی بزرگ شیخ ابو محمد شوشہ کی معیت میں باقاعدہ قبرستان حاضری کی سنت ادا کرنے لگے۔ اس چیز نے انہیں نہایت رقیق القلب بنا دیا اور وہ ساری ساری رات آہ و فغاں اور نالہ و شیون میں گزارنے لگے۔ شیخ کا عبادت، تلاوت اور ذکر میں استغراق بھی بہت بڑھ گیا۔ بایں ہمہ شیخ نے اس سلسلہ کے اخوان کو جمع کر کے "انجمن حصافیہ خیریہ" بھی بنا ڈالی جس کے تین مقاصد تھے۔ اخلاقِ حسنہ کی دعوت، نہی عن المنکر اور عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی روک تھام۔ شیخ کی شخصیت میں روحانیت اور دعوت الی اللہ کے عناصر کو پختہ کرنے میں سلسلۂ حصافیہ کے بانی کی سیرت پر مبنی ایک کتاب "المنهل الصّافی فی مناقب حسنین الحصافی" کا بھی بڑا دخل ہے۔ جسے انہوں نے دسیوں مرتبہ پڑھا اور ہر دفعہ ایک نیا اثر اور تازہ جذبہ حاصل کیا۔ اس سلسلہ میں شمولیت اور اس کے بانی کی سیرت کے بارے میں انہوں نے اپنی ڈائری میں تفصیل سے لکھا ہے اور بہت سے پر اثر واقعات نقل کئے ہیں۔

عناصرِ خمسہ..... جیسے اردو زبان اپنے عناصرِ خمسہ کے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتی، ایسے ہی مستقبل کے حسن البناء کی شخصیت بھی اپنے عناصرِ خمسہ کے بغیر وہ ارتقاء حاصل نہ کر سکتی، جو اسے حاصل ہوا۔ یہ عناصر خمسہ گھر، مدرسہ رشاد، انجمن اصلاح اخلاق، انجمن انسدادِ محرمات اور سلسلۂ حصافیہ شاذلیہ ہیں۔ گھر جہاں انہوں نے توکل، استغناءِ فقر سے محبت اور علم سے دوستی سیکھی اور ان کا سخن دلنواز ہوا۔ مدرسہ رشاد جہاں انہوں نے کثرتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق اور فکرِ رسا حاصل کی اور ان کی نگہ بلند ہو گئی۔ جمعیت اخلاقِ ادبیہ جس نے انہیں اعلیٰ

اخلاق کی قدر و قیمت سکھائی' جمعیت منع المحرّمات جہاں انہوں نے منکرات سے نفرت اور انہیں مٹانے کی تربیت حاصل کی اور سلسلۂ حصافیہ جس میں شمولیت نے ان میں عشقِ الٰہی کی آگ روشن کی' جذبۂ خیر عطا کیا' دلِ دردمند اور جان پرسوز کا تحفہ دیا۔ بلاشبہ ہر فرد کو قدرت اپنے ہاتھوں اپنے کام کے لئے تیار کرتی ہے اور حسن البناء کو اس نے خصوصیت سے تیار کیا۔ چنانچہ ان کے متعلقین کے تاثرات پر مبنی کتاب "الامام الشہید" کا ایک ایک صفحہ اس پر شاہد ہے۔

DR. ISRAR AHMED'S LECTURES

in English Language are available on the following topics in

Video Cassettes:

	Topics	Qty.
1.	Meaning of Iman	2
2.	Process of an Islamic Revolution	3
3.	The duties of a Muslim	2
4.	General Question & Answers	1

Rate: One Video Cassette: Rs. 175/-

Available with:
Maktaba Markazi Anjuman Khuddamul Quran
36-K, Model Town, Lahore.
Phone: 856003 856004

Anjuman Khuddamul Quran Sind
11-Dawood Manzil Sharah-e-Liaqat,
Near Aarm Bagh, Karachi.
Phone: 216586

S.S.Q. Greater Chicago
810, 73rd Street Downers Grove
IL 60516 USA.
Ph: 312-969-6755

کونڑ محاذ پر چھ دن

خواجہ عبدالباری، منگورہ سوات

عام مشاہدے کی بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے عموماً رات کو سونے سے پیشتر بزرگوں سے قصے کہانیاں سننے کیلئے بہت بے تاب ہوتے ہیں اور اس کیلئے خصوصی فرمائشیں کرتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ کہانی سنانے کی دعوت دے دو بچوں کے جھرمٹ آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے اور نہایت شوق سے ہمہ تن گوش ہو کر آپ کو سننے کیلئے بے قرار ہوں گے۔ یہ ایک مستقل اور پائیدار فطری جذبہ ہے جو بچپن سے انسان کے ذہن میں ودیعت کیا گیا ہے اور بڑھاپے تک رہتا ہے۔ بڑے بوڑھے ٹی وی پر ڈرامہ دیکھتے ہیں۔ فلموں اور سٹیج ڈراموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ناول، منفرد آپ بیتیوں اور معاشرے کے انوکھے واقعات ایک دوسرے کو نہایت ذوق شوق سے سنتے سناتے ہیں اور حظ اٹھاتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جنگ عظیم دوم جب ختم ہوئی تو اپنے بزرگوں سے ہم جنگ کے واقعات نہایت انہماک سے سنتے تھے۔ اس جنگ میں اگرچہ جرمن قوم اور ہٹلر نے ہزیمت اٹھائی تھی اور ان کو آج تک مطعون کیا جارہا ہے، لیکن اس وقت ان کے کارناموں، جنگی مہارت، ٹیکنیکی صلاحیت اور بہادری اور شجاعت کے لازوال اور دل دہلا دینے والے واقعات نے اقوام عالم کو گرویدہ بنالیا تھا اور اب بھی ان کی مہمات کی کہانیاں ہمارے اکثر شعراء کے کلام میں محفوظ ہیں۔

۱۹۸۲ء میں جب مجھے سابق امیر جماعت اسلامی صوبہ سرحد مولانا غلام حقانی مرحوم و مغفور کی معیت میں برطانیہ کے دورے پر جانے کا اتفاق ہوا، ایک دن ہم لندن میں سینٹ پال کا گرجا گھر دیکھنے گئے۔ یہ ایک تاریخی گرجا گھر ہے۔ شاہی خاندان کی شادیاں عموماً اس میں ہوتی ہیں، وہاں پر ہم نے دیکھا کہ قومی مشاہیر اور بڑے بڑے جرنیلوں کے مجسمے نصب ہیں، جن کے نیچے ان کے نام، وہ کارنامے اور مہمات جو انہوں نے سرانجام دیئے، وہ مقامات جہاں انہوں نے یہ کارنامے اور مہمات سر کیں غرضیکہ یہ ساری تفاصیل دے دی گئی تھیں۔ یہ واقعات پڑھ کر انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ ابنِ آدم اتنی معرکۃ الآرا مہمات سر کر سکتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات ہیں کہ حضرتِ انسان ان مہماتی قسم کے واقعات میں اتنی زبردست دلچسپی لیتا ہے؟ اس کا نہایت سادہ اور

حقیقت پر مبنی جواب ہمیں قرآن کریم کی سورۃ البلد کی آیت نمبر ۴ میں ملتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے "درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے"۔ اس کی تفسیر میں مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں:

"انسان کے مشقت میں پیدا کئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مزے کرنے اور چین کی بانسری بجانے کیلئے پیدا نہیں کیا گیا ہے' بلکہ اس کے لئے یہ دنیا محنت' مشقت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اس حالت سے گذرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شہر مکہ گواہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنی جان کھپائی تھی تب یہ بسا اور عرب کا مرکز بنا۔ اس شہر مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت گواہ ہے کہ وہ ایک مقصد کیلئے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں' حتیٰ کہ یہاں جنگل کے جانوروں کیلئے امان ہے مگر انسان کے لئے نہیں ہے اور ہر انسان کی زندگی ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر موت کی آخری سانس تک اس بات پر گواہ ہے کہ اس کو قدم قدم پر تکلیف' مشقت' محنت' خطرات اور شدائد کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے جس کو تم بڑی سے بڑی قابل رشک حالت میں دیکھتے ہو وہ بھی جب ماں کے پیٹ میں تھا تو ہر وقت اس خطرے میں مبتلا تھا کہ اندر ہی مر جائے یا اس کا اسقاط ہو جائے۔ زچگی کے وقت اس کی موت اور زندگی کے درمیان بال بھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ پیدا ہوا تو اتنا بے بس تھا کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا تو پڑے پڑے ہی سسک سسک کر مر جاتا۔ چلنے کے قابل ہوا تو قدم قدم پر گرا پڑتا تھا۔ بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک ایسے ایسے جسمانی تغیرات سے اس کو گزرنا پڑا کہ کوئی تغیر بھی غلط سمت میں ہو جاتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ وہ اگر بادشاہ اور ڈکٹیٹر بھی ہے تو کسی وقت اس اندیشے سے اس کو چین نصیب نہیں ہے کہ کہیں اس کے خلاف کوئی سازش نہ ہو جائے وہ اگر فاتح عالم بھی ہے تو کسی وقت اس خطرے سے امن میں نہیں ہے کہ اس کے اپنے سپہ سالاروں میں سے کوئی بغاوت نہ کر بیٹھے وہ اگر اپنے وقت کا قارون بھی ہے تو اس فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں ہے کہ اپنی دولت کیسے بڑھائے اور کس طرح اس کی حفاظت کرے۔ غرض کوئی شخص بھی بے غل و غش چین کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہے کیونکہ انسان پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے"۔

اب آیئے ایک اور زاویئے سے اس حقیقت کو دیکھتے ہیں' نوزائیدہ بچے کو آپ لٹا دیں تو وہ آرام سے کبھی نہیں لیٹے گا' بلکہ جولاہے کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں دونوں مسلسل حرکت کریں گے' ایک پل کیلئے بھی وہ خود آرام نہیں کر سکتا بلکہ اس کو آرام دلانے کیلئے اسے باندھنا پڑے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان دنیا میں حرکت اور جدوجہد کیلئے پیدا ہوا ہے' محنت اور مشقت کیلئے پیدا ہوا ہے۔ محنت کرے گا تو صحت مند بھی رہے گا اور دنیا میں زندگی بھی عزت و وقار سے بسر کرے گا اور آخرت کی فلاح

بھی نصیب ہو گی، لیکن یہاں ایک بات پیش نظر رہے کہ اخروی فوز و فلاح اور کامیابی کا دارومدار محنت و مشقت اور جدّوجہد کو صرف مثبت چینل پر متحرک کرنے پر ہے، اگر اس کو منفی چینل پر حرکت دی گئی تو یہ اسی حساب سے دنیوی تباہی اور اخروی ناکامی پر منتج ہو گی۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اول الذکر کو جہاد فی سبیل اللہ اور مؤخر الذکر کو جہاد فی سبیل الطاغوت کا نام دیا گیا ہے۔

مثبت جدّوجہد کے نتیجہ میں ایک عظیم کردار جنم لیتا ہے اور وہی عظیم کردار، جو عوام الناس کے بس کا روگ نہیں ہوتا بلکہ صرف اولوالعزم انسان ہی وہ ادا کرتے ہیں۔ قصوں کہانیوں اور واقعات میں حسن، نکھار اور دلکشی پیدا کرتا ہے، چونکہ فطری طور پر ہر انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی واقعہ یا کہانی میں جو مہم جویانہ کردار ادا کیا گیا ہے، اسے وہ خود ادا کرے اور یہ بات وہ اپنی فطرت کے عین قریب محسوس کرتا ہے، لہٰذا ان واقعات میں وہ حد سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہ خود بھی ایسا ہی کردار بنے۔ اس مہم جوئی، کارنامہ آرائی، مشنری جدوجہد اور سخت کوشی کو دینی اصطلاح میں "جہاد فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں، عبادات میں، جہاد فی سبیل اللہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایمان سرے سے معتبر ہی نہیں ہے، جس میں جہاد فی اللہ کی طرف پیش رفت نہ ہو۔ سورۃ الحجرات آیت نمبر ۱۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہیں کیا اور اپنی جانوں اور اموال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں"۔ اسی طرح تمام سورۃ التوبہ، جہاد کے احکام سے مزین ہے۔ قرآن کریم نے جہاد کے احکام پر اتنا زور دیا ہے کہ اس کے بغیر ایمان مکمل ہی نہیں ہوتا، چنانچہ منافق وہ لوگ کہلائے جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کو ترک کیا ورنہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ لوگ مسجد نبوی میں حضورؐ کی امامت میں پانچوں وقت حاضر ہوتے تھے، بلکہ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہے کہ جب حضورؐ خطبہ کیلئے منبر پر تشریف لے جاتے تو وہ اٹھ کر لوگوں کو تلقین کرتا کہ اے لوگو! یہ اللہ کے رسول ہیں، ان کے ارشادات غور سے سنو۔ لیکن غزوۂ احد میں ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ یہ اپنے تین سو ساتھیوں سمیت واپس ہو گیا، اور غزوۂ احد میں شمولیت سے انکار کر گیا۔

جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں جو مہمات قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے سر کیں، پوری تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن عصر حاضر میں جو کارہائے نمایاں افغان مجاہدین ادا کر رہے ہیں اور اسلامی تاریخ کا جو تابندہ و درخشندہ باب وہ رقم کر رہے ہیں، قرونِ اولیٰ کے بعد اسلامی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

افغانستان کے متعلق علامہ اقبال نے اپنے کلام میں یوں تو بہت کچھ کہا ہے لیکن فارسی کا ایک شعر، جو انہوں نے آج سے کم از کم ساٹھ ستر سال پیشتر کہا ہو گا اور جس میں انہوں نے اس خطے میں افغان ملت کی اہمیت اجاگر کی ہے، مستقبل کی پیش گوئی کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی پیش گوئی اب حال کا روپ دھار چکی ہے۔ علامہ نے فرمایا ؎

آسیا یک پیکرِ آب و گِل است
ملّتِ افغاں در آں پیکر دل است
از فسادِ اُو فسادِ آسیا
از کشادِ اُو کشادِ آسیا

ایشیا آب و گِل کا ایک پیکر ہے جس میں افغان ملت' دل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں فساد اٹھے گا تو سارے ایشیا میں فساد پھیل جائے گا' اس میں امن اور آشتی کی فضا ہو گی تو سارے ایشیا میں امن اور استحکام ہو گا۔

افغان ملت کی خصوصی حیثیت اس بات سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پچھلے دنوں معاہدۂ جنیوا سے قبل ایک خبر میں وزیر اعظم برطانیہ مسز تھیچر نے ایک بیان دیا تھا کہ ہم نے اپنے سابقہ تجربات کی بناء پر روس کو منع کیا تھا کہ افغانستان میں مداخلت سے باز رہے لیکن جب تک خود روسیوں نے ٹھوکر نہیں کھائی تھی' یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی' لیکن اب وہ سمجھ گئے ہیں۔

---

۲۶ جولائی ۱۹۸۸ء یعنی عید الاضحیٰ کے دوسرے دن ہم نے چھ دن کیلئے کونڑ کے محاذ پر عملی جہاد میں حصہ لیا اگرچہ ہمارے دورانِ قیام کوئی خاص معرکہ تو نہیں ہوا اور نہ ہی آمنے سامنے لڑائی ہوئی' لیکن جو کچھ ہم نے وہاں دیکھا اور سنا اس کی روداد پیشِ خدمت ہے۔

میرے ساتھ سوات سے چھ دوست اور بھی اس قافلے میں شامل تھے۔ ہمارے ایک ساتھی جناب فضلِ واحد صاحب چونکہ اوائل سے ہی افغانستان کے جہاد میں شریک رہے ہیں' وہ تقریباً ہر محاذ پر رہ چکے ہیں' لہٰذا ان کو ہم نے اپنا امیر منتخب کیا کہ وہ جہاد کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہیں' چنانچہ جتنا بھی اسلحہ یہاں استعمال ہوتا ہے ان کو استعمال کرنے اور دیگر تیکنیکی امور پر ان کو عبور حاصل ہے' انصار بھائیوں میں افغانستان کے جہاد میں ان کی شمولیت السابقون الاولون کے زمرے میں آتی ہے۔

جناب فضل واحد کی امارت میں ہم صبح چھ بجے منگورہ سے بذریعہ فلائنگ کوچ تیمر گرہ (دیر) کیلئے روانہ ہوئے۔ احیاء العلوم تیمر گرہ جو جماعت اسلامی کا ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے' سے سلیپنگ بیگ اور دیگر ضروری سامان لے کر ایک پک اپ میں ناوگئی پہنچے۔ یہ باجوڑ ایجنسی کا آخری قصبہ ہے اس سے آگے ممند ایجنسی شروع ہو جاتی ہے۔ ناوگئی سے ایک ٹویوٹا پک اپ ناوا پاس کیلئے کرایہ پر لی اور عباس غونڈ پہنچے۔ عباس خونڈ کونڑ کے محاذ کیلئے حزب اسلامی کا ڈپو ہے۔ یہ حضرت عباسؓ کے نام سے منسوب ہے' یہاں سے مجاہدین مسلح ہو کر محاذ پر جاتے ہیں' ہمیں وہاں پر ایک ایک رائفل اور دو صد راؤنڈ کی ایک ایک پیٹی دی گئی۔ پیٹیاں ہم نے کمر سے باندھ لیں اب ہم مکمل مجاہد نظر آنے لگے تھے۔ عباس غونڈ میں ہی ایک ایک کپ چائے پی کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ بارہ بجے ہم ناوا پاس کنڈو پہنچے۔ یہ پاک افغان بارڈر ہے' ناوا پاس اس طرح ہے جس طرح چترال اور دیر کے درمیان لواری

ٹاپ۔ فرق محض اس قدر ہے کہ یہ لواری ٹاپ سے نسبتاً کم بلند ہے۔ چوٹی پر پاکستانی چوکی ہے جس پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ یہاں ایف سی کا ایک میجر متعین ہوتا ہے۔ زنجیر پار کر کے افغان علاقہ میں داخل ہوئے اور وہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چائے پی اور پھر آگے بڑھ گئے۔ اب پیدل راستہ تھا۔ قرار گاہ (محاذ کا مرکز) آدھ گھنٹے کے فاصلہ پر تھی۔ قرار گاہ کے کمانڈر (مقامی زبان میں قومندان) انجینئر ظریف خاں سے چونکہ بارڈر پر ملاقات ہوئی تھی اس لئے قرار گاہ تک وہ ہمارے ساتھ رہے۔ دن کے بارہ بج رہے تھے' چنانچہ انجینئر صاحب نے نماز تہہ خانے میں پڑھنے کو کہا۔ یہ تہہ خانے حملوں سے بچاؤ کیلئے سخت چٹانوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں جس میں بیک وقت تقریباً ساٹھ ستر افراد با جماعت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ تہہ خانے کے عقب میں اندھیرا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس سے نکلنے کا دوسرا راستہ ہے۔ ہم اپنی ٹارچ کی روشنی میں اندھیرے کو چیرتے دوسری طرف نکل گئے۔ یہ گویا 'EMERGENCY EXIT' یعنی ہنگامی اخراج کا راستہ تھا۔ ظہر کی نماز مجاہدین بھائیوں کے ساتھ ادا کر کے ہم نے کھانا کھایا، جو نہایت سادہ یعنی باسی روٹی اور دال چنے کے شوربے پر مشتمل تھا، لیکن اس کا مزا' بس مت پوچھئے۔ دین کی سربلندی کیلئے مجاہدین وقت گزاری کا معاملہ کر رہے تھے۔ ان کی قربانیاں انشاءاللہ جلد رنگ لائیں گی۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو جناب فضل واحد نے ہمیں اسلحہ کے استعمال اور دیگر تیکنیکی امور کی تربیت دی۔ ۔ کچھ دیر آرام کیا اور پھر قرار گاہ سے متصل گھاٹی میں ایک میٹھے ٹھنڈے چشمہ سے وضو کر کے مجاہدین کے ساتھ نماز عصر ادا کی' نماز یہاں قصر ادا کی جاتی ہے۔ نماز کے بعد مولانا زاہدی صاحب نے دس پندرہ منٹ کیلئے سورۃ آل عمران کی آخری آیت کا درس دیا، جو نہایت جامع اور مؤثر تھا۔ مولانا زاہدی صاحب جو مولانا گوہر رحمٰن صاحب کے شاگرد ہیں اور حدیث کا دورہ بھی انہی کے دارالعلوم تفہیم القرآن میں کیا ہے۔ ایک ہاتھ سے معذور' انتہائی پرہیزگار انسان ہیں اور جہاد کے قابل مشیروں میں شمار ہوتے ہیں۔ مغرب کی نماز تک ہم اسی مسجد میں بیٹھے رہے۔ چھت کے بغیر یہ مسجد تہہ خانے کے سامنے چبوترے پر گھاس پھوس سے بنائی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ کا خوبصورت نقشہ سامنے آتا ہے۔ مجاہد بھائیوں سے تعارفی اور معلوماتی گفتگو کے دوران جہاد وال کے ایسے واقعات سنے کہ ایمان تازہ ہو گیا۔ بھائی فضل واحد نے ہتھیاروں سے متعلق کچھ مزید قیمتی معلومات بھی بہم پہنچائیں اور نمازِ مغرب کے بعد مجھے مجاہد بھائیوں سے خطاب کا حکم ملا۔ میں نے سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۱۱۱ میں جہاد و قتال کی جامع ترین آیت کو موضوعِ سخن بنایا جسے مجاہد بھائیوں نے بغور سنا۔ خطاب کے بعد ہمیں سادہ چاول کی لذیذ خوراک سے نوازا گیا۔ نمازِ عشاء تک مجاہد بھائیوں کی محفل میں مولانا زاہدی صاحب سے جہاد کے روح پرور واقعات سنتے رہے' اور پھر تہہ خانے میں میٹھی سہانی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

۲۷ جولائی کا آغاز نمازِ فجر کے بعد ایک مجاہد بھائی کے دلنشین درسِ قرآن سے ہوا۔ دودھ ملے قہوہ اور باسی روٹی کے ناشتہ کے بعد "آرڈر آف دی ڈے" کا انتظار کرتے رہے' چنانچہ جلد ہی ہمیں

قرار گاہ سے خطِ دوم پر جانے کا حکم ملا۔ خطِ دوم ——————— مجاہدین کی خفیہ اصطلاح ہے۔ اس موضع میں اس محاذ کے کمانڈر قاری فدا محمد صاحب قیام پذیر ہیں۔ وحدت سے موسوم مخابراتی نام کے اس مقام کی مسافت قرار گاہ سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہے۔ FORWARD LINE یعنی خطِ اوّل دشمن کی چوکیوں کے عین سامنے ہے۔ یہاں ایک چوٹی ہے جسے OBSERVATION POINT یعنی ترصد کہتے ہیں۔ اسی سے دشمن کی حرکات پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ لفظ ترصد غالباً رصد گاہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہاں ایک کیمپ (موضع) ہے اور یہاں کے تمام مواضعات قاری فدا محمد صاحب کی زیرِ کمان خدمات انجام دیتے ہیں۔

اگلے مورچوں کیلئے روانگی سے پیشتر ہم نے گھنٹہ بھر اپنے زنگ آلود اسلحہ کی خوب صفائی کی۔ انتہائی دشوار گزار سلسلۂ کوہ کوئی دو گھنٹے میں طے کر کے ہم خطِ دوم پر جا پہنچے۔ یہ موضع بھی ترصد کے عین سامنے نسبتاً کم بلند چوٹی پر واقع ہے۔ قاری فدا محمد صاحب نے سو گز آگے پیش قدمی فرما کر ہماری عزت افزائی کی۔ قاری صاحب کے مجاہدانہ کارنامے ہم پہلے بھی سن چکے تھے' لیکن اب بالمشافہ ملاقات میں ان کا طرزِ عمل بھی خوب سے خوب تر پایا۔ قاری صاحب پشتو زبان نہایت دھیمے لہجہ میں اور لفظوں کو الگ الگ کر کے بولتے ہیں۔ ان کے ہر لفظ سے خلوص' حلاوت و عزیمت ٹپکتی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

خطِ دوم (وحدت) پر ہم نے تقریباً ہر قسم کا اسلحہ موجود پایا خصوصاً بیم یک (BEAM ONE) جس سے میدان سے میدان کیلئے میزائل داغا جاتا ہے۔ یہاں کی ہر بلندی پر گن فٹ ہے۔ یہاں چونکہ چشمہ نہیں ہے' لہٰذا خچروں پر پانی لایا جاتا ہے۔ قلتِ آب کی وجہ سے پانی کا محتاط استعمال صرف کھانے پکانے اور پینے کیلئے ہوتا ہے' وضو کی بجائے تیمم کی سنت جاری ہے۔

بعد از نمازِ عصر قاری فدا محمد صاحب نے سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۱۱۱ کو موضوعِ درس بنایا۔ دروس تو ہم نے بہت سنے تھے لیکن اس کوہستانی سلسلہ میں محاذ پر جو کیف طاری ہوا اس کا صرف تصور ہی ممکن ہے۔ پھر قاری صاحب کی زبانِ سیف سے جو بیک وقت حافظِ قرآن' قاری' سپاہی اور مجاہدین کے نڈر کمانڈر ہیں۔ یہ روسیوں کو آمنے سامنے دعوتِ مبارزت دیتے رہے انہیں واصل جہنم کیا اور خود بھی گھائل ہوئے۔ یقیناً قاری صاحب نے کونٹر محاذ پر جرأت و شجاعت کی انمٹ داستان کو جنم دیا ہے اور ان کا نام تاریخ کنڑ میں جگمگا تا رہے گا۔ قاری صاحب کے کارنامے ہم کہیں اگلے صفحات میں بیان کریں گے۔ آیئے ذرا اس محاذ کا نظارہ کریں جس پہ ہم موجود ہیں۔

درس کے بعد ٹہلتے ٹہلتے ہم ترصد موضع جا پہنچے یہ موضع ہمارے پڑاؤ کے سامنے نسبتاً بلند چوٹی پہ واقع ہے۔ اس لئے کونٹر کی تمام تر وادی سامنے بکھری نظر آتی ہے۔ وادی کے درمیان میں دریائے کنڑ کی روانی بہت دلکش لگتی ہے یہیں سے مجاہدین دشمن کی چوکیوں پر نگاہِ غضب رکھتے ہیں۔ مشہور قصبہ

سرکنو کو بھی دور سے دیکھا۔ چونکہ جنگ سے پہلے تجارت کے لئے یہ قصبہ شہرت رکھتا ہے یہیں سے مال چمرکنڈ' دیر باجوڑ ہوتا ہوا سوات' بٹ خیلہ اور سخاکوٹ کی منڈیوں میں پہنچتا تھا' اور میں بھی بغرضِ تجارت ۱۹۴۹ء سے اس علاقہ سے وابستہ رہا ہوں' اس لئے یہ نام اجنبی ہرگز نہیں ہے۔ چمرکنڈ پاک افغان سرحد پر وہ مشہور گاؤں ہے جہاں مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید بریلوی نے قیام فرمایا تھا۔

یہی قصبہ سرکنو قاری فدا محمد صاحب کا آبائی قصبہ ہے۔ قاری صاحب نے دو سال پیشتر کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا تھا کہ "ہمارا ایک عزیز جو خاد کارکن تھا قصبہ کے دفاع پہ مامور تھا۔ اچانک ایک روز مخابرے (WIRELESS) پہ اس سے رابطہ قائم ہو گیا۔ عزیز نے پوچھا۔ قاری صاحب کیا حال ہے اور کچھ دنوں سے آپ کے راکٹ کیوں خاموش ہیں۔ میں نے جواب دیا وقت کی بات ہے۔ چند روز بعد ہی وہی مکان جس میں میرے یہ عزیز مقیم تھے ہمارے آپریشن کے دوران دستی بم کی زد میں آ گیا۔ اس کے جسم کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ پاس ہی دوسرے عزیز بھی موجود تھے جنہوں نے ملامت کی اور جواباً میں نے بھی نہایت سخت الفاظ میں انہیں سرزنش کی۔" اپنے نظریہ میں ان کی پختگی کا ایک اور واقعہ ایک مجاہد نے یوں بیان کیا کہ "ایک ادھیڑ عمر شخص زخمی حالت میں اوندھا پڑا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا' میں نے سیدھا کیا تو سامنے میرا ہی چچا تھا۔ اگرچہ وہ خلقی تھا' لیکن میرے والد کی مشابہت کے باعث مجھے بہت رحم آیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ چچا! اس کفر سے توبہ کر لو۔ کلمہ پڑھ لو اور اپنی جان طاغوت کے لئے مت دو۔ میں تجھے پاکستان لے جا کر ماہر معالج کو دکھاؤں گا اور انشاء اللہ آپ تندرست ہو جائیں گے۔ اس نے آہِ سرد بھرتے ہوئے آہستہ سے کہا' انقلاب میں گیارہ سال گزار دیئے ہیں' اب آخری سانس کلمہ سے اپنی زباں کیوں ناپاک کروں۔ غصہ میں میں بے قابو ہو گیا اور کلاشن کوف کے برسٹ فائر سے اس کا سر اور گندی زبان ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔" حق اور باطل کی رزم آرائی ازل سے جاری ہے اور رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بو لہبی

ابو جہل کو جب دو ننھے مجاہدین نے میدانِ بدر میں پچھاڑا اور اس کی گردن کاٹنے لگے تو ابو جہل نے فخریہ کہا کہ ذرا نیچے سے کاٹنا تاکہ نیزے پہ لٹکی ہوئی معلوم ہو کہ یہ کسی سردار کی گردن ہے۔ درحقیقت جہادِ افغانستان نے مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق پھر یاد دلایا ہے۔ کاش یہ دوبارہ کبھی فراموش نہ کر سکیں۔

بات ہو رہی تھی قاری صاحب کے آبائی قصبہ سرکنو کی۔ یہ دریائے کنڑ کے اس طرف واقع ہے، اُس پار نو آباد گاؤں ہے۔ دریا پر نو آباد سے موسوم انتہائی مضبوط فولادی پل ہے۔ اور کچھ دوسرے گاؤں چغر سرائے 'اسد آباد' نارنگ 'پشت' دونئ اور بیلہ دریا کی دونوں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ تادمِ تحریر یہ علاقہ مجاہدین کی زد میں تھا لیکن کل کی خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ مجاہدین نے اس تمام علاقہ پر قبضہ کر لیا ہے اور اب قاری صاحب اپنے ہی قصبہ میں پہنچ کر تمام علاقہ کی قیادت کر رہے ہیں۔

ہماری یہاں آمد سے پہلے سنا ہے کہ پشت قصبہ پر مجاہدین کے سلفی گروپ نے بھرپور حملہ کیا تھا لیکن منصوبہ بندی کے فقدان سے وہ قبضہ نہ کر سکے۔ اس لڑائی میں تقریباً چار صد سے زائد کابل فوجی ہلاک ہوئے تھے اور شہداء کی تعداد بھی بیس کے لگ بھگ تھی۔ خطِ دوم پر ہم نے مجاہدین کے اداس چہرے دیکھے کیونکہ انہیں شہداء کی لاشیں واپس نہیں ملی تھیں۔ لیکن جب انہیں لاشیں مل گئیں تو وہ پھر سے پرسکون تھے۔

اذانِ مغرب تک ہم ترصد کی چوٹی سے درختوں کی آڑ میں چھپ کر تمام علاقے کا منظر دیکھتے رہے۔ گاڑی تو در کنار انسان اور حیوان نما کوئی چیز بھی حرکت میں نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ مویشی تو مجاہدین بطور مالِ غنیمت ہانک لاتے ہیں اور پھر ایک گائے کے عوض افغان گورنمنٹ سے پچاس ہزار افغانی وصول کرتے ہیں۔ نو آباد پل کے قریب دو ٹینک نظر بھی آئے تو وہ مجاہدین کی راکٹ باری سے فوراً دبک گئے۔ نمازِ مغرب کے لئے ہم واپس پڑاؤ پر آ گئے۔ کھانا کھایا اور مجاہدین سے محوِ گفتگو رہے۔ نمازِ عشاء کے بعد مولانا زاہدی صاحب کا درسِ قرآن تھا مگر میں پہرے کی ڈیوٹی کے لئے اپنے مسکنِ فرض پہ جا کھڑا ہوا۔

اگلے روز ایک ضعیف العمر مجاہد میرا کبر کی رہبری میں خطِ اوّل کے لئے روانہ ہوئے۔ پر خطر دشوار گزار راستے کو بناتے سنوارتے ہم سوئے منزل رواں تھے۔ دورانِ سفر میرا کبر اپنے دلیر شہید صاحب زادے اولس خاں کی داستانِ شہادت سناتے رہے۔ اس نے موضع کے سامنے جہاں سفید بیراغ لہرا رہا تھا اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہیں روسیوں نے اسے گھیرے میں لے کر شہید کیا۔ میرا نڈر بے باک دلیر بیٹا انٹی ایئر کرافٹ گن (ANTI AIR CRAFT GUN) کا ماہر تھا اور اسے نشان زد کیا جا چکا تھا۔ اسلام کا یہ سپوت نرغے میں آ کر کچھ زیادہ ہی دلیر ہو جاتا تھا۔ اس سے پہ گھاٹیاں ٹینکوں سے اٹی ہوئی تھیں اور فضا میں ان کی مدد ہیلی کاپٹر کر رہے تھے۔ میرے اولس خاں کے مورچے کے آس پاس آگ برس رہی تھی اور میرا سرفروش شیر زیکویک سے ہر طرف دشمنوں کی لاشوں کے انبار لگا رہا تھا۔ آخر وہ سینے پہ ایک گولی کھا کر خدائے برتر کے ہاں کامران و کامیاب ہوا مگر روسیوں کو ایسا سبق دیا کہ وہ پھر کبھی اس علاقہ کی طرف رخ نہ کر سکے۔ میرا کبر خود بھی نڈر مجاہد تھا اس لئے اپنے زخمی دل کو پشتو اشعار میں سمو کر اپنا اور ہمارا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد ایک پہاڑی پہ ڈھلوان نما میدان نظر آیا جس میں بمباری سے جلے ہوئے درختوں کے جھنڈ دکھائی دیئے۔ میرا کبر نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہیں ہمارے کمانڈر قاری فدا محمد صاحب نے روسیوں کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا تھا۔ اس معرکہ کی داستاں ہمیں قاری صاحب نے کچھ یوں سنائی تھی "اُن دنوں خطِ دوم کی ترصد پر روسیوں کا قبضہ تھا۔ اوپر چوکی پر روسی قابض تھے اور نیچے میدان ہیلی کاپٹروں سے بھرا پڑا تھا۔ ہم درخت کی آڑ میں بے حس و حرکت سکتے کے عالم میں پڑے تھے ——— ایسے مواقع پر بڑے بھائی کی شہادت نیز دوسرے عزیزوں کی یاد سے میرے اعصاب مفلوج ہو جاتے ہیں۔

اس وقت بھی کچھ ایسی ہی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ کھلی آنکھوں ہم ان کو ہیلی کاپٹروں سے اتر کر اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہے تھے لیکن میں تو جیسے سحر زدہ ہو گیا تھا۔ اپنے ساتھی کو ہدایت تو کیا دیتا خود ہی ہلنے سے قاصر تھا۔ مشین بھی تھی اور اس میں سو گولیوں سے بھرا ڈبہ بھی..... اس صبر آزما کشمکش میں میرے مجاہد ساتھی نے کلاشن کوف کا منہ کھول دیا۔ پہاڑوں میں گولیوں کی گونج سے میں بیدار ہوا اور پھر تو میں نے نصف دائرے کی شکل میں مشین کو گھمانا شروع کر دیا۔ پلاسٹک کے مجسموں کی مانند روسی گر رہے تھے۔ ان میں ایسی بھگدڑ مچی کہ سنبھل ہی نہ سکے۔ تقریباً پنتالیس روسی کھیت رہے اور زخمیوں کی تعداد کا ہمیں پتہ نہ چل سکا۔ مغرب کی اذانیں ہو چکی ہوں گی خطرناک صورت حال کا تقاضا بھی یہی تھا، چنانچہ ہم درختوں کی آڑ میں بخیر و عافیت اپنے مورچے میں واپس پہنچ گئے۔ روسیوں نے وہ رات ترصد کی چوٹی پر بسر کی کچھ ہیلی کاپٹر لاشوں کو لے جانے کے لئے رکے رہے۔ روسیوں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ لاشوں کو گلنے سڑنے سے بچانے کے لئے پیٹ چاک کر کے خالی کر دیتے ہیں تب روس واپس بھیجتے ہیں"۔

قاری صاحب کی مختصر داستانِ شجاعت کے بعد آیئے ہم سفر پہ رواں رہیں۔ یہ راستہ دو گھنٹے میں طے کرنے کے بعد ہم آخری چوکی پہ پہنچے جسے مجاہدین خطِ اول کا نام دیتے ہیں۔ یعنی وہ مورچہ جو عین دشمن کے سامنے ہو۔ اگرچہ کل بھی ہم نے خطِ دوم سے اس علاقے کو بغور دیکھا تھا لیکن آج ہم دشمن کی چوکیوں کے بالکل قریب تھے اور قاری صاحب کا آبائی قصبہ سرکنو مجاہدین کی براہِ راست زد میں تھا۔

خطِ اول کے کمانڈر (قومندان) دوست محمد خاں ہیں' جو ہمیں نہایت اخلاص و محبت سے ایک درخت کی چھاؤں میں لے گئے' قہوہ پلایا اور جہاد کے امور پہ روشنی ڈالتے رہے۔ جناب دوست محمد خاں نے ایک دلچسپ بات یہ بتائی کہ حالتِ جنگ میں بھی کبھی کبھار دونوں فریقین اپنے اپنے ہاں گانے بجانے کی محفل سجاتے ہیں۔ چونکہ ایک ہی علاقہ سے متعلق ہیں اس لئے استہزائیہ انداز میں ایک دوسرے پر روسی امریکی ایجنٹ ہونے کا فقرہ تھوپتے رہتے ہیں۔ دورانِ گفتگو ایک مجاہد غلام سرور نے دریائے کونڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی حسرت سے کہا "اس جزیرہ کو بیلا کہتے ہیں یہیں پر ہماری اپنی زمینیں تھیں' ندی کنارے چارپائی پر بیٹھے ہم مویشیوں کا خالص دودھ اور مکئی کی روٹی (جوارے) مل جل کر بڑی رغبت سے کھایا کرتے تھے۔ بڑے بڑے شہتوت کے درختوں کی گھنی چھاؤں میں جو مزا آتا وہ ناقابلِ فراموش ہے"۔ اگرچہ مجاہدین سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن قلتِ وقت اور دو گھنٹے کی مزید مسافت کا تصور ہمیں لے اٹھا۔ خچروں کی نقل و حرکت کے لئے راستہ بناتے' جنگلی میووں سے لطف اندوز ہوتے ہم بالآخر عصر سے قبل ہی اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ یہاں آ کر میدان گرم پایا۔ خطِ اول سے پیغام ملا تھا کہ نو آباد پل کے قریب دشمن کے ٹینک حرکت میں ہیں۔ وہیں سے جمعیت کے موضع کو نشانہ بنایا جا رہا تھا تقریباً سات گولے تو ہمارے سروں سے گزرتے ہوئے جمعیت کے ٹھکانے کے نزدیک پھٹے لیکن نقصان ہر گز نہ ہوا جمعیت کا موضع ہماری قیام گاہ کے سامنے چوٹی پر

واقع تھا یہ ایک طویل پہاڑی سلسلہ ہے۔ اب جو مجاہدین نے بیم یک (BEAM ONE) سے میزائل برسانے شروع کئے تو پورے علاقے میں تباہی مچادی۔ موقع غنیمت جان کر فضل واحد صاحب اور میں نے بھی ایک ایک میزائل داغا۔ نشانہ درست رہا اور ہمیں قلبی سکون ملا۔ تمام میزائل پل کے نزدیک آر پار برس رہے تھے چنانچہ جلد ہی بزدل دشمن کے ٹینک خاموش ہو گئے۔ ہمیں یہی بتایا گیا تھا کہ عید کے فوراً بعد حملے (عملیات) شروع ہوں گے اسی لئے ہم نے جہاد میں شرکت کا چھ روزہ پروگرام ترتیب دیا تھا لیکن ہماری بدنصیبی کہ اس دوران کوئی خاص معرکہ پیش نہ آیا یہ حملے کیوں نہ ہوئے اس کا علم صرف بالائی سطح پر کمانڈروں ہی کو ہوتا ہے۔ ڈیوٹی تو ہماری خطِ دوم پر ہی تھی ، لیکن چونکہ فرصت ہی فرصت تھی اس لئے ہم نے ظہر تک ترصد پر متعین مجاہدوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے قاری صاحب سے اجازت طلب کی اور انہوں نے ہمیں بخوشی اجازت دے دی۔

آدھ گھنٹہ بعد ہم ترصد کی چوٹی پر تھے جہاں ایم ایم ۸۲ توپ نصب تھی۔ جسے وہ اپنی زبان میں "ہشتادودو" کہتے ہیں۔ چونکہ یہ چوٹی دشمن کی تیز دوربین سے بخوبی نظر آتی ہے اس لئے بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ بے احتیاطی میں کئی مجاہدین جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ مجاہدین کا کہنا تھا کہ یہ کافر آجکل ہم سے چھیڑ چھاڑ سے گریز کرتے ہیں لیکن مہمان نوازی کا تقاضا ہے کہ ہم محتاط رہیں۔ اگرچہ کونٹر افغانستان کے دیگر محاذوں مثلاً پکتیا ' پنج شیر ' قندھار ' ہرات ' بدخشاں ' لوگر ' بریکوٹ اور غزنی سے مختصر ہے بلکہ عشر عشیر بھی نہیں تاہم یہاں پہنچ کر ایک عظیم معرکہ آرائی کے نشانات ملتے ہیں یہاں تقریباً سبھی پہاڑ عرفات اور منیٰ کی پہاڑیوں کی طرح سامان سے اٹے پڑے ہیں۔ پلاسٹک ' ٹین کے خالی ڈبے ' کیپسول ' چھوٹے بڑے کارتوسوں کے خول ' بموں کے ٹکڑے ' جنگی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کے ڈھانچے غرضیکہ انسان کی حیات و موت کا ہر مواد یہاں موجود رہا ہے۔ ترصد کی مسجد سے نیچے پہاڑ کاٹ کر انتہائی محفوظ مورچہ بنایا گیا ہے قرار گاہ کی طرح یہاں بھی غار نما تہہ خانہ ہے ، جو کسی بھی ہنگامی حالت میں کار آمد ہے۔

بارہ بجے تک ہم ترصد میں مجاہدین سے محوِ گفتگو رہے اور پھر نمازِ ظہر کے لئے اپنی قیام گاہ کو چل دیئے۔ کھانے کے بعد سونے کا ارادہ کیا لیکن گرمی اور مکھیوں نے نیند اڑا دی۔ رات کو پہرہ ہوتا تھا ، اس لئے دن کو آرام کی خواہش بس خواہش ہی ہوتی۔

قاری فدا محمد صاحب سے ہماری ملاقات تو انتہائی خوشگوار رہی تھی لیکن شاید انہیں راس نہیں آئی۔ وہ اچانک صاحبِ فراش ہوئے۔ میں نے نبض سے اندازہ لگایا کہ حرارت ۱۰۳ درجہ تو ضرور ہوگی۔ یہاں تو ابتدائی طبّی امداد کا بھی انتظام نہیں ہے۔ متعلقہ شعبہ کے تحریکی بھائیوں سے استدعا کروں گا کہ وہ میڈیکل ایڈ کا خاطر خواہ بندوبست فرمائیں اور گاہے گاہے وہاں اپنی طبّی خدمات پیش کریں ، کیونکہ محاذِ جنگ انتہائی تندرستی کا تقاضی ہے۔

اگلے روز نمازِ فجر کے لئے بہ سبب نقاہت قاری صاحب نے مجھے امام بنایا اور اصرار کیا کہ درسِ

قرآن بھی دوں۔ میں نے سورۃ الصف کی ابتدائی تین آیات پر روشنی ڈالی۔ ویسے مجاہدین کو درسِ قرآن دینا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ کہاں یہ میدانِ کارزار کے مجاہد اور کہاں ہم زبانی جمع خرچ کے بندے۔ لیکن ان سے خطاب کو میں نے باعثِ سعادت جانا اور ثواب لوٹا۔ درس کے بعد اپنی قیام گاہ پر باسی نان اور بغیر دودھ کی چائے کا ناشتہ کیا۔ ایسی لذتیں محاذِ جنگ پہ ہی نصیب ہوتی ہیں۔

پانچویں روز کا آغاز قاری صاحب کی جامع دعا سے ہوا جو انہوں نے نمازِ فجر کی دوسری رکعت میں رکوع اور سجدہ کے درمیان پڑھی۔ (قاری صاحب اب قدرے تندرست تھے) یہی قنوت نازلہ رمضان المبارک میں حرم پاک میں دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ لیکن ان کوہساروں میں جو سوز و گداز اور کیف و سرور محسوس کیا اسے الفاظ کا روپ دینا ممکن ہی نہیں۔ گھنٹوں اس کا کیف قلب پہ طاری رہا۔ مجاہدین کے لئے ہچکیوں کے درمیان آمین کہنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہنگامی صورتِ حال اور میدان جہاد میں معرکہ آرائی کے دوران قنوتِ نازلہ کا پڑھنا سنتِ رسولؐ ہے۔ قاری صاحب نے روسی لیڈروں' افغانی حکمرانوں اور تمام اعدائے دین میں سے ایک ایک کا نام لے کر بد دعا کی۔ مجھے احساس ہوا کہ دین کے جوہر تو میدانِ جہاد ہی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ نیز فہمِ دین بھی جہاد کا مرہونِ منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے جہاد کو چوٹی کا عمل قرار دیا ہے۔ میدان جہاد میں شدت سے احساس دامن گیر رہتا ہے کہ بندگی' تزکیۂ نفس اور عبادات کے تمام اصول و فروعات' معاونینِ جہاد و قتال ہیں اگر ان کا رخ جہاد کی جانب نہ ہو تو سراسر ضلالت و گمراہی ہے' ایسی گمراہی جس کا احساس و ادراک بھی انسان کو نہیں ہوتا بقول علامہ اقبال ۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

عید کے موقع پر ہم نے مجاہدین کی حالتِ زار سے متاثر ہو کر گائے ذبح کر کے اور اسے پکوا کر تینوں مورچوں تک پہنچانے کا پروگرام بنایا تھا۔ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لئے حزبِ اسلامی کے چند اکابرین بھی رات تک پہنچ چکے تھے۔ گمانِ غالب تھا کہ شاید علاقے میں پیش قدمی کا پروگرام لے کر آئے ہوں۔ اس لئے بھی ہم نے یہ موقع غنیمت جانا۔ تمام مجاہدین و اکابرینِ حزبِ اسلامی کو ہماری طرف سے دعوت دی گئی۔ دوپہر کا کھانا ہم سب نے اکٹھے کھایا۔ اکابرین رخصت ہو گئے اور قاری صاحب بھی ضروری کام سے قرار گاہ چلے گئے۔ ہم چونکہ چشمہ پر غسل کے لئے چلے گئے تھے واپسی پر معلوم ہوا کہ قاری صاحب نے پیغام دیا ہے کہ آئندہ کا پروگرام معلوم نہیں ہے اس لئے اگر آپ واپس جانا چاہیں تو کل مجھے قرار گاہ میں ملتے جائیں۔

اگلے ہی روز واپس جانے کا پروگرام ٹھہرا' محاذ پر اپنے اس قیام کو سعادت جان کر بعد از عصر میں نے درسِ قرآن دیا۔ سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲۵ کا انتخاب کیا اور مقدور بھر جہاد فی سبیل اللہ' اس کی اہمیت' طریقۂ کار اور فوائد کو اجاگر کیا۔ رب کریم ہماری ان ادنیٰ کاوشوں کو قبول فرمائے۔

اگلے روز علی الصبح نماز فجر کے بعد ہم نے قرار گاہ کا قصد کیا۔ میرے بزرگ بھائی کے دورانِ سفر پاؤں زخمی ہو گئے تھے' مجاہدین نے سرحد تک ان کے لئے خچر کا بندوبست کر دیا تھا چنانچہ وہ سیدھے ناواپاس روانہ ہو گئے۔ لیکن ہم حسب پیغام قاری صاحب سے ملنے قرار گاہ پہنچے۔ مخابرے (WIRELESS) پر ہماری روانگی کی اطلاع انہیں مل چکی تھی اس لئے منتظر بیٹھے تھے۔ قاری اور انجینئر ظریف صاحب نے ہمیں الوداعی قہوہ پلا کر بڑی محبتوں سے رخصت کیا۔ ناواپاس پہنچے تو وہاں بھائی بشیر صاحب بھی موجود تھے۔ یہیں سے ایک ڈائسن پک اپ کے ذریعہ عباس غونڈ پہنچے' جہاد کی وردیاں ان کے حوالہ کیں اور تیمر گرہ چل دیئے۔ احیاء العلوم تیمر گرہ میں سلیپنگ بیگ واپس کر دیئے' جناب رئیس احیاء العلوم یوسف صاحب نے ظہرانے سے شاد کام کیا۔ جناب یوسف صاحب رموزِ جہاد پہ خاصی دسترس رکھتے ہیں' ان سے اور دیگر مجاہدین سے مختلف محاذوں کے متعلق مفید گفتگو ہوتی رہی۔ چار بجے ہم نے یوسف صاحب اور مجاہدین سے اجازت طلب کی اور سوات کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس طرح ہمارا یہ روح پرور' تجربات سے پُر' ایمان افروز' مقدس اور انوکھا سفر اختتام پذیر ہوا۔

قارئین حضرات! اگرچہ ہمارا یہ سفر ختم ہو چکا ہے لیکن حق و باطل کی رزم آرائی ہنوز جاری ہے اور انشاء اللہ بہت جلد افغانستان میں خالص اسلامی مملکت قائم ہو گی۔ آمین۔

ماہنامہ 'میثاق' کی

خصوصی رعایتی پیشکش

۸۸ء کی مکمّل فائل

جنوری تا دسمبر ۱۲ شمارے

مضبوط دیدہ زیب جلد میں ہدیہ -/۵۰ روپے

گتّے کے مضبوط کور میں ہدیہ -/۴۰ روپے

نوٹ: مذکورہ قیمت میں ڈاک خرچ شامل نہیں۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، فون: ۸۵۲۶۸۳

مکالمہ

دسمبر ۸۸ء میں منعقدہ محاضراتِ قرآنی (کراچی) میں
امیر تنظیم اسلامی اور مدبر کبیر کی "گفت و گو"
جسے کیسٹ سے من و عن نقل کیا گیا ہے

صلاح الدین صاحب..... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! سب سے پہلے تو میں سامعین کی طرف سے، اپنی طرف سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اسلامی ریاست اور سیاست کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی اور اس کا ایک مکمل تصور سامنے رکھا..... لیکن جیسا کہ ہر تقریر اور گفتگو کے دوران کچھ سوالات ذہن میں اٹھتے ہیں جو تھوڑی سی مزید وضاحت چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے چار پانچ سوالات نوٹ کئے ہیں جس سے وہ الجھن رفع ہونے میں مدد ملے گی..... (ڈاکٹر صاحب کی آواز..... انشاءاللہ) جو میں نے اور شاید دوسرے لوگوں نے محسوس کیا ہے۔

پہلی بات یہ کہ جو بنیادی آیت حدودِ اطاعت کے سلسلے میں آپ نے تلاوت فرمائی۔ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ" ایک تو یہ کہ اس میں یہ اطاعت الگ الگ ہے یا یہ ایک مربوط سلسلہ ہے کہ جو شخص اولی الامر منکم، میں سے اللہ کی اطاعت کرنے والا ہو، رسول کی اطاعت کرنے والا ہو گا اس کی اطاعت کی جائے گی اگر وہ ان سے بالکل ہٹ کر خود اپنی اطاعت کروانا چاہے، خواہ وہ مسلمانوں ہی میں سے ہو اور پہلی دو اطاعتوں کی کوئی اس کے اندر اور علامت نہ پائی جاتی ہو، اللہ کی اطاعت کی اور رسول کی اطاعت کی بلکہ اس کے اندر بغاوت یا گریز کی ساری علامات موجود ہوں تو کس درجے میں ہمیں اس کی اطاعت کرنا چاہئے اور کہاں اس کی اطاعت ساقط ہو جاتی ہے ایک وضاحت تو یہ درکار ہے۔

ڈاکٹر صاحب..... اصولی طور پر تو اس کو RESIST کرنا لازم ہے مسلمانوں کے لئے..... اب RESISTANCE کی کیا کیا شکلیں ہوں، آیا وہ کوئی مسلح بغاوت ہو یا AGITATION ہو، اس لئے کہ "DEMOCRATIC PROCESS" کسی معاشرے میں جاری ہو تو اسی کو اختیار کیا جائے پھر یہ حالات پر بھی DEPEND کرے گا کہ جس نوع اور درجے کا انحراف اس پر بھی اس کا دارومدار ہو گا

چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ کفرِ بواح کا حکم ہو تو "لاطاعة لمخلوق فی معصیته الخالق" اور "لاسمع و لاطاعه" پر عمل ہو گا یعنی نہ سننا ہے اور نہ اطاعت کرنا ہے البتہ خروج' بغاوت اور مسلح اقدام کی جو شرائط ہیں' وہ ایک طویل معاملہ ہو جائے گا اس لئے کہ فقہا کے مابین اس میں اختلاف ہے اور مجھے امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کی رائے سے اتفاق ہے کہ مسلمان فاسق و فاجر حکمرانوں کے خلاف مسلح بغاوت بھی جائز ہے لیکن اس کی شرائط بڑی سخت ہیں یعنی اتنی طاقت حاصل کی جا چکی ہو کہ کامیابی بظاہر احوال یقینی نظر آئے یہ نہیں کہ چند لوگوں کو کھڑا کیا' ایک ہنگامہ برپا کیا اور انہیں مروا دیا یہ نہیں..... بلکہ اس کے لئے وہی REVOLUTIONARY PROCESS لازم ہو جائے گا جو میں بیان کرتا رہتا ہوں اور جو انشاءاللہ چار جنوری کو پھر سامنے آئے گا' مختصراً یہ کہ پہلے آپ کو جمعیت فراہم کرنا ہو گی' منظم جمعیت ہو ان کے اندر قوت ہو ان کی تعداد کافی ہو وغیرہ و غیرہ' بہرحال یہ تو ہیں ان کی TECHNICAL DETAILS۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک مسلمان پر لازم ہے منکرات کو RESIST کرنا اور یہ RESISTANCE نہی عن المنکر کے ان تینوں مدارج کے ساتھ ہو گی یعنی "بالید' باللسان اور بالقلب" اور بالقلب جو ہے وہ سب سے ادنیٰ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ "ذٰلک اضعف الایمان" اور "لیس وراء ذٰلک من الایمان حبة خردل" گویا اگر طاقت حاصل ہو جائے اور اس کی شرائط پوری ہو جائیں تو نہی عن المنکر ہاتھ سے یعنی قوت کے ساتھ ضروری ہے!۔

صلاح الدین صاحب..... اسی میں ایک شرط یہ بھی عائد کی جاتی ہے کہ کم سے کم وہ نماز قائم کرتا رہے..... اگر وہ تارک صلوٰۃ ہو تو پھر اسی سلسلہ میں.....

ڈاکٹر صاحب..... نہیں..... میں اس موضوع پر مزید میں نہیں جاؤں گا۔ نہ میں اس کے لئے PREPARED ہوں اور نہ ہی یہ اس وقت کا موضوع ہے۔

صلاح الدین صاحب..... جی بہتر' اگلا سوال یہ ہے کہ شوریٰ کے سلسلے میں آپ کی رائے سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ 'EVOLUTIONARY PROCESS' کے ذریعے اور وہ جو انفرادی قیادت تھی یعنی بادشاہت یا قبائلی سردار سے منتقل ہوتے ہوتے وہ اب ایک اجتماعی صورت میں سامنے آئی ہے..... لیکن یہاں ایک سوال اور جو پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے فقہا نے جہاں شوریٰ کا ذکر کیا ہے کہ وہ COLLECTIVE ادارہ ہے اور اسے DECISION MAKING کا کام کرنا چاہئے اور ڈیمو کریسی میں تو در حقیقت انتظامیہ اور مقننہ اور وہ مقننہ تو اپنی جگہ ہے لیکن انتظامیہ بھی اس کے رکن ہونے کی وجہ سے انتظامیہ ہے وہ اس کا ایک PART ہے۔ سوال یہ ہے کہ مستشار کی بھی کچھ شرائط عائد کی گئی ہیں (یا نہیں؟) آپ نے حقوق کی بات کی کہ اگر حضرت ابو بکرؓ اور عبداللہ ابن ابی ایک باپ کے بیٹے ہوتے تو وراثت

یکساں تقسیم ہوتی، مسئلہ وراثت اور حقوق کی یکسانیت کا نہیں، اہلیت کا ہے مثلاً ہر شہری اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے سرمائے سے ہسپتال قائم کرے لیکن ہسپتال قائم کرنے کے بعد وہ اس بات کا پابند ہے کہ کم از کم اس (شخص) کو ڈاکٹر (کی حیثیت سے) رکھے جس کے پاس ڈاکٹری کی بنیادی سند موجود ہو، ہر شہری کو ہم اس کے اندر بطور ڈاکٹر شریک نہیں کر سکتے اس طریقے سے شوریٰ کے ادارے میں جانے والے لوگوں کے بارے میں مسلمانوں کو یہ اطمینان ہونا چاہئے کہ وہ قرآن و سنت کے تحت چونکہ قانون سازی کرنے جا رہے ہیں اس لئے اس کے اندر کم از کم امیدواری کی شرائط ضرور ہونی چاہئیں اور آپ نے خود بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے کہ خلافت راشدہ تو ان شخصیات کی وجہ سے ہے اگر وہ شخصیات نہ ہوتیں تو نظام نہ چلتا..... تو سوال یہ ہے کہ ہم اگر خلافت راشدہ کی وہ شخصیات نہیں لا سکتے تو کیا شرائط کو بالکل معطل یا ساقط کر دیں یا کہیں نہ کہیں اس کا کوئی لحاظ رکھا جانا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب..... میرا یہ خیال ہے کہ یہ POST- REVOLUTIONARY PROCESS کی بات ہے اور اس وقت شرائط بھی متعین کی جا سکتی ہیں جیسے میں تجویز کر رہا ہوں کہ ووٹر کی عمر چالیس سال کر دی جائے۔ ایسے ہی REVOLUTION کے بعد جو رائے عامہ ہو گی وہ جب قبول کرے گی ان شرائط کو تو وہ شرائط بھی عائد ہو جائیں گی لیکن فقہا کی بحثوں کا حوالہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے حالات کے ساتھ REFERENCE نہیں رکھتا یہ اس دور کی بات ہے جبکہ اسٹیٹ کے یہ تین آرگن یعنی مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ علیحدہ علیحدہ DEFINED نہیں تھے اب جیوڈیشری کا جو ایک مقام معین ہو چکا ہے اور دستور بالاتر دستاویز کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے اور بڑے سے بڑا ہیڈ آف دی اسٹیٹ حتیٰ کہ خود پارلیمنٹ سب اسی دستور ہی کے تحت کام کرتے ہیں اور دستور میں ترمیم کو بہت ہی مشکل اور محال بنا دیا جاتا ہے تاکہ وہ موم کی ناک نہ بن جائے بلکہ اس کے ساتھ ایک دوام اور تسلسل ریاست کے امور کا برقرار رہے اس اعتبار سے اس وقت وہ معترضین اس میں نہیں رہیں گی..... اور ظاہر ہے کہ اسلامی ریاست میں جیوڈیشری کے لئے شرائط لگائی جا سکتی ہیں کہ جج کون ہوں گے ان کے لئے لازمی تعلیم کا کیا معیار ہو گا۔ لیکن واضح رہے کہ وہ ایک علماء بورڈ کی حیثیت سے نہیں ہوں گے بلکہ ان کی حیثیت منصفوں (JUDGES) کی ہو گی..... (صلاح الدین صاحب کی آواز..... صحیح) میرے نزدیک ان تین ORGANS کی تعیین در حقیقت کہ PROCESS OF EVOLUTION کا وہ ثمرہ ہیں جو بہت ہی عمدگی کے ساتھ ان مسائل کو حل کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

صلاح الدین صاحب..... آپ نے ایک اصطلاح کی بہت خوبصورت وضاحت کی ہے۔ THEO-DE MOCRACY تھیوڈیموکریسی کہ اسلامی ریاست ڈیموکریسی بھی ہے اور ساتھ ساتھ اس میں مذہب بھی شامل ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ان شرائط کو ساقط کر دیا جائے مثلاً حضرت عمرؓ نے چھ

افراد کا انتخاب ان کی اہلیت کی بنیاد پر کیا تھا کہ ان میں سے جس کو چاہو کرو..... اگر وہ آزاد چھوڑ دیتے تو لوگ اس کا لحاظ کئے بغیر کسی کو بھی منتخب کر سکتے تھے۔ یہی وہ بات ہے کہ THEO-DEMOCRACY کی اصل SPIRIT کو اس طرح انہوں نے MAINTAIN کیا کہ لوگوں کو انتخاب کا اختیار بھی دے دیا اور یہ اہتمام بھی کیا کہ کہیں ایسے کو منتخب نہ کر دیں جو یہ ضروری شرائط پوری نہ کرتے ہوں۔ تو آج اگر ہم اپنی پارلیمنٹ کو تھیوڈیموکریسی کی اسی شرط اور سپرٹ کے ساتھ رکھنا چاہیں تو یہ THEO کی شرط کیسے پوری ہو گی جب تک کہ مستشار کی وہ شرائط اس کے اندر عائد نہیں کی جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب..... آپ نے میری ایک بات پر شاید توجہ نہیں کی کہ میں نے عرض کیا تھا کہ حضورؐ نے کوئی شرط نہیں لگائی تھی، کوئی بورڈ نہیں بنایا تھا، کوئی نامزدگی نہیں کی تھی، تو حضرت عمرؓ کی سنّت سے پہلے تو حضورؐ کی سنّت موجود ہے۔ یہ میرے نزدیک ایک بہت بڑا VOTE OF CONFIDENCE تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تربیت دیئے ہوئے صحابہ کرامؓ کے حق میں ظاہر کیا ہے کہ آپؐ کو پورا اعتماد تھا کہ بغیر کسی ایسے DIRECTIVE اور تعیّن کے امت صحیح فیصلہ کرے گی..... اس اعتبار سے میرے نزدیک یہ چاروں راستے کھلے ہیں، میں نے اس لئے کہا تھا کہ کوئی راستہ معین نہیں ہے یہ طریقہ بھی درحقیقت "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کے تحت طے ہو جائے گا..... اور COLLECTIVE رائے عامہ جب اسلام کے حق میں جب اپنے آپ کو ASSERT کرے گی تو پھر یہ ساری چیزیں اسلام کے مطابق ہو جائیں گی۔

صلاح الدین صاحب..... لیکن ڈاکٹر صاحب! ایسا بھی نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی منشاء کے اظہار کا کوئی اشارہ.....

ڈاکٹر صاحب..... اصل میں اس طرح بحث پھر لمبی ہو جائے گی اور اس میں شیعہ سُنّی کی بحث بھی آ جائے گی۔

صلاح الدین صاحب..... نہیں شیعہ سُنّی کی بحث قطعاً نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے..... (ملی جلی گفتگو)

ڈاکٹر صاحب..... دیکھئے یہاں کا فارمیٹ (FORMAT) یہ ہے کہ آپ حضرات کو سوالات کرنا ہیں، کسی ایک مسئلے کے اوپر لمبی بحث نہیں ہو سکتی۔

صلاح الدین صاحب..... میں تو بحث کر ہی نہیں رہا۔ میں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا کہ حضورؐ نے اشارہ ضرور کر دیا تھا کہ میرے مصلّے پر نماز پڑھانے کے لئے کون آدمی زیادہ اہل ہے..... یہ اشارہ جو ہے کم از کم ایک امامت کے لئے یا خلافت کے لئے یا آپ کے بعد کے لئے، کسی منصب کے لئے ہمیں ایک.....

ڈاکٹر صاحب..... لیکن یہ اشارہ اتنا خفی تھا کہ انصار کی سمجھ میں نہیں آیا! (حاضرین کی آواز میں واہ' واہ.....)

ابھی آپ سمجھئے بات کو کہ وہ اشارہ اتنا خفی تھا کہ انصار کی سمجھ میں نہیں آیا..... انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع تھے اور فیصلہ کر رہے تھے اور وہاں پر تو بیعت ہونے ہی والی تھی حضرت سعد ابن عبادہؓ کے ہاتھ پر۔

صلاح الدین صاحب..... لیکن پھر WITHDRAW کر لیا انہوں نے' وڈڈرا کر لیا انہوں نے..... عورت کی سربراہی کے بارے میں آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سلسلے میں میری صرف ایک گذارش ہے۔ میرے سامنے میثاق کا وہ خصوصی شمارہ ہے جس میں "اسلام میں عورت کا مقام" کے عنوان سے آپ نے بڑی تفصیل سے اسی موضوع پر بحث کی ہے۔ مسئلہ صرف عورت یا مرد کا نہیں ہے' مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے جو ستر' حجاب اور عورت کی ذمہ داری اور اس کے مقام سے بحثیں کی ہیں آخر بینظیر بھٹو صاحبہ جو وزیر اعظم ہیں ان سے مستثنیٰ کس بنیاد پر قرار دی جا رہی ہیں اس سے قطع نظر کہ منصب کیا ہے۔ یعنی معاشرے میں ان کا مقام آپ کی ان ساری تشریحات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اگر نہیں رکھتا تو اس سے استثنا کا کیا جواز ہے۔

ڈاکٹر صاحب..... ان کے ساتھ مطابقت بیگم عفیفہ ممدوٹ کی کتنی ہے؟ (حاضرین کی واہ واہ کی آوازیں.....)

صلاح الدین صاحب..... ان کی بھی نہیں ہے..... (حاضرین کی آوازیں جاری ہیں.....)

ڈاکٹر صاحب..... سوال یہ ہے کہ یہ سارا کام جو کیا دھرا ہے ہم سب کا ہے' ہم سب ہی اس میں مجرم ہیں اور برابر کے شریک ہیں۔

صلاح الدین صاحب..... آپ شریعت کی ترجمانی کریں۔

ڈاکٹر صاحب..... وہ میں کر رہا ہوں کہ یہ اسلام کے خلاف ہے..... میں نے کہا ہے اور وضاحت سے کہا ہے' میری تقریر چھپی ہے' میثاق میں چھپی ہے' ندا میں چھپ چکی ہے!..... چلئے.....

صلاح الدین صاحب..... تو گویا اگر کوئی عورت منصب وزارت پر ہو جائے تو اس کے بعد.....

ڈاکٹر صاحب..... میں نے تو ابھی اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ میں تو عورت کو اسمبلی کا ممبر بھی بنانے کو بھی تیار نہیں۔

صلاح الدین صاحب..... ایک اور بات' آپ نے مثال دی ہے کہ علماء کو سرے سے..... میرا خیال ہے' یہ میری تجویز بھی ہے اور میں آپ سے پوچھنا بھی چاہتا ہوں کہ یہ بات صحیح ہے کہ اہل دین کے کرنے کا کام اصلاً تو وہی ہے جس کی طرف آپ نے نشاندہی کی ہے لیکن ساتھ ساتھ کیا یہ قدغن بھی لگائی

جا سکتی ہے کہ علماء کو سرے سے اس میں شریک نہیں ہونا چاہئے یا اس کی گنجائش موجود ہے کہ وہ بھی CANDIDATE بن سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب..... عجیب بات ہے! آپ نے شاید میری تقریر سنی نہیں' میں نے تو کہا ہے کہ وہ اس میں حصہ لے سکتے ہیں' وضاحت سے کہا ہے میں نے' بالواسطہ بھی وہ اس کے اوپر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور بلاواسطہ حصہ بھی لے سکتے ہیں۔ اب بھی لے رہے ہیں' مفتی محمود صاحب نے بھٹو صاحب کو شکست دی تھی' نورانی میاں صاحب کا میں نے تذکرہ کیا تھا..... تو کیوں یہ شبہ آپ کو ہوا.....؟

صلاح الدین صاحب..... اچھا! اسی طریقے سے آپ نے مثالیں دی تھیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کی' وہیں بالکل متصل ایک مثال اور ہے قاضی ابو یوسفؒ کی..... قاضی ابو یوسف صاحب نے وہ منصب قبول کر لیا جس منصب کو حضرت ابو حنیفہؒ نے مسترد کر دیا تھا اور اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کتاب جو حضرت امام ابو حنیفہؒ نے مرتب کی تھی وہ قاضی ابو یوسف کی اس قوت نافذہ کی وجہ سے مملکت میں ایک وسیع دائرے کے اندر نافذ ہو گئی..... تو یہ معاملہ صرف اورنگ زیب عالمگیر پر نہیں بلکہ اس سے پہلے وہیں ہمارے سامنے ایک مثال موجود ہے..... اگر وہ شوریٰ دین کا علم نہ رکھنے والوں کے پاس ہو کردار کے لحاظ سے منکرات زدہ لوگوں کے پاس ہو اور کردار کی جو بنیادی شرائط اسلام نے نافذ کی ہیں' ان سب سے وہ بالکل خالی اور عاری ہو تو پھر اس کے نفاذ اور تشریعی قوانین جو بننے ہیں قرآن و سنت سے اس کا کتنا امکان باقی ہے۔

ڈاکٹر صاحب..... دیکھئے! میں عرض کروں گا کہ اس میں جو قاضی ابو یوسفؒ کا طرز عمل امام اعظم ابو حنیفہؒ کے طرز عمل سے مختلف ہے تو اس ضمن میں میری توجیہ وہی ہے جو امیر معاویہؓ کے طرز عمل اور حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ' حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ چاروں کے طرز عمل میں ہے یعنی انہوں نے اپنے بیٹے کو نامزد کیا اور اس کے لئے بیعت ولی عہدی لی ..... تاہم میں سمجھتا ہوں کہ میرا ایمان نہیں قائم رہے گا اگر ایک لمحے کے لئے بھی میں حضرت امیر معاویہؓ کی نیت پر حملہ کروں..... میرے نزدیک انہوں نے وقت کے حالات کا تقاضا یہی سمجھا کہ بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ گیا ہے اور کبار صحابہ کی جماعت اب رخصت ہو گئی ہے' اب اس وقت جو معاشرہ ہے' اس کی شیرازہ بندی کے لئے یہ اقدام ضروری ہے..... گویا ایک قدم نیچے اترے ہیں وہ..... چنانچہ پوری اُمّت مانتی ہے کہ ان کے دور حکومت اور نظام کا وہ مقام نہیں ہے جو حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ' حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کا ہے۔ یہی

لہ معلوم نہیں صلاح الدین صاحب نے کس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اور 'قوت نافذہ' کے قاضی ابو یوسفؒ کے ہاتھ میں ہونا چہ معنی دارد!

فرق ہے میرے نزدیک کہ قاضی ابو یوسفؒ نے بھی وقت کا یہ تقاضا سمجھا اور اسی کو اختیار کر لیا..... اس وقت تک وہ فقہ اس طرح مرتب شکل میں بھی نہیں تھی جس شکل میں کہ فتاویٰ عالمگیری مرتب ہوئے ہیں' اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں..... اسی لئے ان میں ایک بنیادی نوعیت کا فرق بھی ہے اور دوسرے یہ کہ میرے نزدیک اعلیٰ تر مقام وہی ہے جو حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔ البتہ جو قاضی صاحب نے قبول کیا وہ میں سمجھتا ہوں کہ RULE OF NECESSITY کے تحت انہوں نے اس وقت حالات کے لئے انسب سمجھ کر قبول کر لیا' لیکن ہے وہ درجے میں کم تر!

صلاح الدین صاحب..... ہاں یہ بات صحیح ہے۔

ڈاکٹر صاحب..... الحمدللہ.....

صلاح الدین صاحب..... لیکن جو میں عرض کرنا چاہ رہا تھا وہ یہ کہ قوت نافذہ کی وجہ سے وہ بہرحال موثر ہو کر نافذ ہو گیا..... اسی طریقے سے آج کی پارلیمنٹ میں بھی اگر اہل دین کی اکثریت ہو اور مستشار کی جو شرائط ہیں وہ پیش نظر رکھی جائیں تو اس کے نافذ ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب..... یہ تو بہت بڑا "اگر" ہے یہ ہو جائے تو اسلام آ جائے گا بس.....!

بقیہ: تذکرہ وتبصرہ

ہمارا چھوٹا سا قافلہ یعنی راقم الحروف خود' میری اہلیہ 'میری سب سے چھوٹی بچی اور اس کا بچہ یعنی میرا نواسہ 'اور رفقائے گرامی قمر سعید قریشی اور مولانا فیض الرحمٰن صاحب جمعرات ۵ر جنوری کی رات کو جدہ پہنچے اور چونکہ اس بار ویزا صرف دو ہفتے کا ملا تھا اور زیادہ وقت ہم مکہ مکرمہ میں بسر کرنا چاہتے تھے 'لہٰذا ایئرپورٹ سے سیدھے حرم شریف پہنچے اور دونوں باہمت رفقاء نے تو شبِ جمعہ ہی میں تہجد کے وقت مناسکِ عمرہ مکمل کر لئے..... میں نے اور خواتین نے جمعہ کی صبح یہ سعادت حاصل کی..... علاوہ ازیں اس بار کسی تصنیف و تالیف کا پروگرام بھی نہیں تھا بلکہ خواہش یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ سعادت قربِ بیت اللہ کی حاصل کی جائے۔ خصوصاً حرم کی با جماعت نماز کوئی نہ چھوٹے 'لہٰذا ہم نے ایک خاصے گراں معاوضے پر ایک فلیٹ (شقہ) حرم کے بہت قریب حاصل کر لیا تھا۔ لیکن ابھی وہاں دھائی دن ہی گزرے تھے کہ ایک نئے کرم فرما فاروق چشتی صاحب جن سے غائبانہ تعارف رفیق گرامی زین العابدین صاحب (کراچی) کی وساطت سے ہو چکا تھا لیکن ذاتی ملاقات پہلی ہی تھی 'کشاں کشاں اپنے "دولت خانے" پر لے گئے۔ اور الحمدللہ کہ یہ بھی حرم سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ اور اپنے قیام مکہ مکرمہ کے بقیہ آٹھ دن ہم جملہ اعتبارات سے' بالکلیّہ ان کے "مہمان" رہے..... اور انہوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

یہ ساری تفصیل بے مقصد بیان نہیں ہوئی 'اس کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ "تکبیر" کا ۱۲ر جنوری والا شمارہ سعودی عرب میں غالباً ۷ر یا ۸ر جنوری ہی کو پہنچ گیا تھا۔ اور ہم نے متعدد حضرات سے حرم ہی میں موعودہ مضمون کا تذکرہ بھی سنا اور اس کے ضمن میں چہ میگوئیاں بھی کانوں میں پڑیں لیکن دل میں ارادہ یہی رہا کہ اسے سرزمین حرم میں پڑھ کر طبیعت کو منغّص نہیں کروں گا۔ مبادا یہاں کی سعادتوں اور برکتوں میں کمی آجائے..... پاکستان کا قصہ پاکستان واپس جا کر ہی نبیڑا جانا بہتر ہے..... لیکن جب ہمارے میزبان فاروق چشتی صاحب نے اصرار کیا کہ اس پر ایک نظر ضرور ڈال لیں تو میں انکار نہ کر سکا..... اور اب جو میں نے اس پر سرسری نظر ڈالی تو واقعہ یہ ہے کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور ایک بار تو زمین اور آسمان سب گھومتے ہوئے محسوس ہوئے..... اس لئے کہ مدیر "تکبیر" کے

ساتھ میرے حسن ظن کے تمام شیشے چکناچور ہو کر رہ گئے..... اور میں حیران و ششدر رہ گیا کہ بظاہر اتنے متین اور متدین شخص نے میری کردار کشی کی کوشش میں جملہ "معروف" ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ غلط بیانی اور تہمت و افترا کے تمام "منکر" ہتھکنڈے بھی استعمال کر ڈالے!۔ گویا ۔

"ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا"

ابتدائی چند صفحات پڑھ کر جب میں نے بقیہ کے ضمن میں چشتی صاحب سے معذرت کر لی کہ پورا مضمون میں پاکستان واپس جا کر ہی پڑھوں گا تو شاید انہوں نے میرے دل کی یہ بات بھانپ لی کہ میں اس تحریر کے ضمن میں "قالوا سَلٰماً" پر عمل کروں گا اور کوئی جواب نہیں دوں گا تو انہوں نے بار بار اصرار کر کے مجھ سے یہ وعدہ حاصل کر ہی لیا کہ میں اس کا مفصل جواب تحریر کروں گا..... یہی وجہ ہے کہ میں یہ مفصل تحریر مجبوراً سپرد قلم کر رہا ہوں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ میری اپنی طبیعت اس پر نہ پہلے آمادہ تھی نہ اب ہے!

اس سلسلے میں اس سے قبل کہ راقم خود کچھ عرض کرے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کا وہ خط ہدیۂ قارئین کر دیا جائے جو انہوں نے ۱۴ر جنوری ۸۹ء کو محترم صلاح الدین صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔

واضح رہے کہ شیخ صاحب موصوف میرے نوجوان ساتھیوں (یا "عقیدت مندوں") میں سے نہیں بلکہ بزرگ معاونین میں سے ہیں جو اس وقت عمر کی آٹھویں دہائی طے کر رہے ہیں۔ وہ "قوم پنجابی سوداگراں دہلی" کے معزز اور معروف فرد اور جماعت اسلامی کے سابقون الاولون میں سے ہیں۔ خود صحافت سے ان کا نہایت قدیم رشتہ ہے۔ چنانچہ دہلی میں انہوں نے ایک ہفت روزہ "الجمیل و یکلی" کے نام سے جاری کیا تھا جس میں روزنامہ "جنگ" کے مالک و مدیر میر خلیل الرحمٰن ان کے جونیئر کی حیثیت سے شریک تھے۔ بعد ازاں وہ طویل عرصے تک ماہنامہ "سوداگر" کراچی کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۲ء سے وہ میرے تقریباً ہمہ وقت اور ہمہ تن ساتھی اور رفیقِ کار..... بلکہ مشیر اور سرپرست ہیں! کچھ عرصے سے وہ عارضۂ قلب (ANGINA) میں مبتلا ہیں۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ میرے ساتھ عمرے کی سعادت سے بہرہ مند ہوں۔

لیکن عین وقت پر تکلیف کے عود کر آنے کے باعث سفر ملتوی کرنا پڑا..... چنانچہ وہ دو ہفتے کی تاخیر سے روانہ ہو سکے' نتیجتاً وہ ۱۹ر جنوری کی رات کو جدہ پہنچے..... جبکہ میری واپسی ۲۰ر کو ہو گئی!..... ان سطور کی تحریر کے وقت تک وہ ارض مقدس ہی میں ہیں' اللہ کرے کہ وہ عمرہ اور زیارتِ مسجد نبویؐ کی سعادتوں سے باحسن وجوہ بہرہ مند ہو کر بخیر و عافیت وطن واپس آئیں۔ اور راقم الحروف اور تنظیم اسلامی تادیر ان کے مشفقانہ تعاون سے مستفید ہوں۔ (مزید واضح رہے کہ جدہ کی ملاقات میں انہوں نے اپنے اس خط کا کوئی ذکر مجھ سے نہیں کیا۔ اور میری نظر سے اس کی نقل پاکستان واپس آکر ہی گزری!) شیخ صاحب موصوف کا خط درج ذیل ہے۔

باسمہ تعالیٰ سبحانہ

۱۴ر جنوری ۱۹۸۹ء

مکرمی و محترمی' السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

۳ر جنوری ۸۹ء کی شب کو انجائینا کا پرانا مرض عود کر آیا چنانچہ اپنے معالج کی ہدایت پر تمام سرگرمیوں سے دست کش ہو کر BED REST کر رہا ہوں۔ اسی دوران آپ کے مؤقر ہفت روزہ تکبیر کا شمارہ بابت ۶ر تا ۱۲ر جنوری ۸۹ء نظر سے گزرا..... اس شمارے میں آپ کے مضمون جس کا آپ نے عنوان "پاسباں مل گئے کعبے سے صنم خانے کو" مقرر کیا ہے اور اس کی وضاحت کے لئے ذیلی عنوان "عورت کی سربراہی اور اقبالؒ کے نظریۂ اجتہاد پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ارشادات کا ایک جائزہ" رقم فرمایا ہے۔ اس کا بغور مطالعہ کیا۔

امر واقعہ یہ ہے آپ کی اس تحریر کے مطالعہ سے راقم کو دلی صدمہ پہنچا۔ جس کے دو سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ اس دورِ فتن میں گنتی کے جن چند صحافیوں کو بعض اختلافات آرا کے باوصف راقم حق گو' اصول پسند اور خدا ترس صحافی سمجھتا چلا آرہا ہے ان میں آپ کا ایک اونچا مقام راقم کے شعور و ادراک میں قائم ہے لیکن آپ کے اس مضمون سے یہ حسن ظن مجروح ہوا ہے۔

دوسرا یہ کہ عورت کی سربراہی کے متعلق آپ نے ڈاکٹر صاحب سے جو مؤقف منسوب کیا' وہ واقعہ کے بالکل خلاف ہی نہیں بلکہ صریح طور پر بہتان کی

قبیل کا معاملہ ہے۔ آپ کو اگر اس سے اختلاف ہے تو اس کا آپ کو پورا پورا حق ہے اس پر تنقید کی بھی آپ کو کامل آزادی ہے لیکن خدارا دنیادار صحافیوں کی طرح کسی قائل کے قول کو بالکل غلط معنی پہنا کر اور اس کی بات میں اپنا مفہوم ڈال کر تنقید و تنقیص کا رویہ اختیار کرنے سے اجتناب کیجئے۔ قومی اسمبلی کے انتخابات کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے جن خیالات 'اپنی جن آرا اور اپنے جس مؤقف کا جمعہ کے خطابات میں اظہار کیا ہے' ان تمام خطبات کی صحیح صحیح تلخیص "ہفت روزہ ندا" اور ماہنامہ میثاق کے دسمبر ۸۸ء اور جنوری ۸۹ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ (میثاق کے دونوں شمارے اس عریضہ کے ساتھ ارسال خدمت ہیں)۔ آپ جیسے ذمہ دار اور باخبر صحافی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ آپ نے ان کا مطالعہ نہ کیا ہو گا۔ اگر مطالعہ کے بعد آپ نے یہ رائے قائم کی ہے کہ " پاسباں مل گئے کعبے سے صنم خانے کو " تو یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے اور آپ کو حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھنے کی سعادت سے بہرہ مند فرمائے۔ لیکن اگر آپ نے ان کا مطالعہ کئے بغیر محض اخبارات کی ادھوری اور غلط سلط رپورٹنگ پر بھروسہ کر کے یہ رائے قائم کی ہے تو مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ آپ نے خود پر ظلم کیا ہے اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد پر بھی..... موصوف پر یہ ظلم تو انشاءاللہ ان کے حق میں اجر و ثواب بن جائے گا لیکن آپ نے خود پر جو ظلم کیا ہے میری رائے میں اس کا مواخذہ ہو کر رہے گا۔ الا یہ کہ آپ صدق دل سے اس پر توبہ فرمائیں اور اس رائے سے علیٰ رءوس الاشہاد رجوع فرمائیں۔

مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تواصی بالحق میں تکلفات سے کام نہ لے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ سطور خالص نصح کے جذبے کے تحت رقم کی گئی ہیں۔

مزاج کے خلاف کوئی بات محسوس ہو اور اس سے کسی نوع کا تکدّر قلب میں پیدا ہو تو اس کے لئے عفو کا طالب ہوں۔

والسلام مع الاکرام

خاکسار جمیل الرحمٰن عفی عنہ

پ۔ن

آپ نے اس مضمون میں اپنے سوالات اور ڈاکٹر صاحب کے جوابات کا جو حوالہ دیا ہے' اس کے متعلق نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ اس میں بھی احتیاط کا دامن آپ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بین السطور آپ کی ناراضگی اور برہمی واضح طور پر جھلکتی نظر آتی ہے۔ آپ نے جو تانا بانا تیار کیا ہے' وہ اپنے notes اور یادداشت سے تیار کیا ہے۔ لیکن ہمارے پاس تو ان سوالات و جوابات کا ٹیپ میں ایک ایک لفظ محفوظ ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں اور اس کو شائع کرنے کے ارادہ کا اشارہ فرمائیں تو آپ کے سوالات اور ڈاکٹر صاحب کے جوابات حرف بحرف اور لفظ بلفظ ٹیپ سے منتقل کر کے آپ کو ارسال کئے جاسکتے ہیں۔

نیاز کیش
جمیل الرحمٰن عفی عنہ

بشرف نظر جناب محترم محمد صلاح الدین صاحب مدظلہ
مدیر اعلیٰ ہفت روزہ تکبیر۔ کراچی۔
((نوٹ) خط کو دوبارہ صاف لکھنے کا موقع نہیں مل سکا لہٰذا مسودہ ہی ارسال خدمت ہے)

رفیق مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کا یہ خط پڑھتے ہی میں نے ایسے محسوس کیا جیسے میرے ذہن سے ایک بھاری بوجھ ایک دم اتر گیا ہو۔ اس لئے کہ ایک توع "متفق گردید رائے بو علی با رائے من!" کے مصداق یہ اطمینان ہوا کہ صلاح الدین صاحب کی تحریر پر ان کا تاثر بھی بعینہٖ وہی تھا جو میرا تھا..... اور دوسرے یہ کہ اگرچہ میں نے فاروق چشتی صاحب اور بعض دوسرے احباب سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں "تکبیر" کے مضمون کا جواب ضرور دوں گا لیکن میں اپنی "کوتاہ قلمی" کے پیش نظر سخت پریشان تھا کہ محاضرات قرآنی میں میری تقریر کے بعد جو طویل "گفت و گو" اور ردوقدح صلاح الدین صاحب سے ہوئی تھی اس کے ضمن میں صحیح صورت واقعہ کی تفاصیل کیسے بیان کروں گا۔ مجھے اپنے "گاودی پن" کا اعتراف ہے کہ میرا ذہن اس پورے پروگرام کی آڈیو اور وڈیو ریکارڈنگ کی طرف منتقل ہی نہیں ہوا۔ بھائی جمیل الرحمٰن صاحب کے خط سے اس معاملے کے آسان ترین حل کی طرف رہنمائی ہو

گئی.........فجزاه الله احسن الجزاء!!

چنانچہ اب ان کی طویل تحریر کا جو حصہ میری تقریر کے بعد کے سوال جواب سے متعلق ہے' اس کے ضمن میں تو بحمد اللہ ع "تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی" کے مصداق اس پر اکتفاکی جارہی ہے کہ اس پوری گفتگو کو لفظ بلفظ (صرف 'کا' 'کے' 'کی اور ہے یا تھا کی تصحیح کے ساتھ) شائع کیا جارہا ہے۔ تاکہ قارئین خود ہی اس واقعاتی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو پہلے بیان کیا جاچکا ہے' اس کا "تکبیر" کی تحریر سے مقابلہ و موازنہ کر کے رائے قائم کرلیں!

البتہ اس تحریر کے اول و آخر کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنی ضروری ہیں۔

چنانچہ تمہیدی حصے سے متعلق عرض ہے کہ۔

۱۔ "اس بار محاضرات قرآنی کا یہ پروگرام لاہور کی بجائے کراچی میں" نہیں ہوا۔ بلکہ اس سال کا ریگولر پروگرام' جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے' وہ تھا جو مارچ ۸۸ء میں لاہور میں منعقد ہو چکا تھا اور جس میں دوسرے مقررین کی طرح خود صلاح الدین صاحب نے بھی "مفصل" اظہار خیال فرمایا تھا۔

۲۔ کراچی کے اس اضافی پروگرام کا FORMAT پہلے سے طے تھا اور اگر صلاح الدین صاحب نے اس کے علم کے باوجود اس میں شرکت کا ایثارِ عظیم گوارا کیا تھا تو بعد میں اس پر "ONE MAN SHOW" کی پھبتی چست کرنا ان کے مقام اور مرتبہ سے بہت فرو ہے۔

۳۔ میری تقریر کی تحسین و ستائش کے لئے مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کرنے کے فوراً بعد "ایک عاجزانہ اور خیر خواہانہ درخواست" کے منافقانہ الفاظ کے ساتھ میری ذات پرستی اور عامیانہ نفسیات کے حوالے سے جارحانہ حملہ ایک نہایت رکیک حرکت ہے! جو گٹر جرنلزم کے بازار کی تو نہایت پسندیدہ شے ہو سکتی ہے' کسی سنجیدہ اور متین' اور بالخصوص متدین صحافی اور دانشور کو ہرگز زیب نہیں دیتی!

ذرا فوری تقابل (SIMULTANEOUS CONTRAST) ملاحظہ ہو' کہ ایک جانب "تقریر" کے بارے میں تو ارشاد ہوتا ہے۔

> "ڈاکٹر صاحب کا لیکچر بلاشبہ بڑا ہمہ جہتی اور سیر حاصل تھا۔ اللہ نے انہیں اظہار و استحضار کی بھرپور صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان کے کلام کی روانی اور زبان و بیان کی سحر انگیزی تقریر کی طوالت کے باوجود سامعین کی توجہ اور دلچسپی میں کوئی

ضعف و اضمحلال نہیں آنے دیتی۔ سامعین سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر داد و تحسین کی مدھم آوازوں اور دعائیہ کلمات کے ساتھ سنی گئی!"

لیکن اس کے فوراً بعد "مقرر" کی "تحلیل نفسی" ان الفاظ سے ہوتی ہے:۔

"مجھے سابقہ تجربات کی طرح اس بار بھی مسلسل یہ احساس ہوتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے مرعوبیت اور ان پر سبقت کی خواہش کے الجھاؤ سے ہنوز اپنے ذہن کو فارغ نہیں کر سکے ہیں۔ وہ مولانا مودودیؒ کے دائرۂ فکر سے باہر نکل کر اپنی ایک منفرد فکری و نظریاتی شناخت قائم کرنے کی کشمکش سے نجات نہیں پا سکے۔ ان کے اندر آج بھی مولانا مودودیؒ بولتے دکھائی دیتے ہیں مگر اس طرح جیسے ان کے گلے پر بار بار ہاتھ رکھ کر کوئی اپنی آواز اونچی کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ڈاکٹر صاحب جتنی جلد اس ذہنی کیفیت سے شفایاب ہو سکیں، ان کے حق میں بہتر ہے۔ یہ ایک عاجزانہ اور خیر خواہانہ درخواست ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف!"

اس "معصومانہ" حملہ کا ترکی بہ ترکی جواب 'اور "عطائے تو بہ لقائے تو!" کے مصداق اس تحریر کا اسی عامیانہ نفسیات کی اصطلاحات میں تجزیہ تو یہ بنتا ہے کہ اس کا محرر ایک شدید مرعوبیت اور گہرے احساس کمتری سے بچاؤ کی کوئی اور سبیل نہ پا کر گالی دینے ہی میں نفسیاتی آسودگی تلاش کر رہا ہے 'لیکن ہم اس سے صرف نظر کرتے ہوئے پوری سنجیدگی کے ساتھ جاننا چاہتے ہیں کہ محترم صلاح الدین صاحب کا مشورہ ہے کیا؟

مثلاً کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم بھی ان احسان فراموش لوگوں کے مانند ہو جائیں جو ان لوگوں کا نام تک لینا پسند نہیں کرتے 'جن سے انہوں نے کسی بھی اعتبار سے اکتسابِ فیض کیا ہو 'بلکہ اپنے نیاز مندوں کو یہ باور کرانے کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ جو علم یا فہم انہیں حاصل ہے وہ یا تو وہ رحم مادر ہی سے لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے یا براہ راست ان ہی پر آسمان سے نازل ہوا ہے..... یا کم از کم یہ کہ کُل کا کل "طبعزاد" ہے؟..... یہ طور و انداز جنہیں پسند ہو انہیں مبارک 'ان سطور کا راقم اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ وہ اس خبط میں ہرگز مبتلا نہیں ہے۔ بلکہ اس نے تو آج سے ۳۳ سال قبل بھی (۱۹۵۶ء میں) جماعت اسلامی کے فکری قائدین

بالخصوص مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے بارے میں صراحت کے ساتھ لکھ دیا تھا کہ :۔

"میں نے جماعت اسلامی کی گود میں آنکھ کھولی ہے۔ اور جس طرح ایک بچہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اسی طرح میں نے بھی ان حضرات کی آنکھوں سے دیکھنا' ان کے کانوں سے سننا' ان کے دماغوں سے سوچنا' اور ان کی زبانوں سے بولنا سیکھا ہے"۔ (تحریک جماعت اسلامی صفحہ ۴۱)

اور پھر اس کے پورے بیس برس بعد (۱۹۷۶ء میں) جب اپنے فہم و فکر قرآنی کے "ابعادِ اربعہ" یا اپنے اکتساب فیض کے سلاسل اربعہ کا ذکر کیا تو اس میں بھی دو "شیخین" (حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ) اور دو "ڈاکٹرین" (ڈاکٹر اقبال مرحوم اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم) کے ساتھ ساتھ پورے اہتمام کے ساتھ ذکر کیا تھا مولانا فراہیؒ اور ان کے شاگرد رشید مولانا اصلاحی' اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور ان کے معنوی خلیفہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا!..... اور اب بھی اس کے باوجود کہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں سے راقم کو نہ صرف یہ کہ بعض معاملات میں شدید اختلاف ہے بلکہ ان کے بعض نظریات کو وہ انتہا درجہ کی گمراہی سمجھتا ہے' ان سے ابتدائی کسب فیض کا ڈنکے کی چوٹ اقرار کرتا ہے..... اور فی الواقع ان دونوں کے لئے احسان مندی کے جذبات اپنے دل میں موجود پاتا ہے! اور راقم کا مزاج بحمد اللہ یہ ہے کہ اگر دوران تحریر و تقریر کوئی ایسا نکتہ نوک قلم یا نوک زبان پر آجاتا ہے جو اصلاً کسی اور صاحب علم و دانش نے بیان کیا ہو تو اگر وقت کی انتہائی تنگی مانع ہو جائے تو دوسری بات ہے' ورنہ وہ اصل نکتہ ور کا حوالہ دیئے بغیر گزر جانے کو "حق بحقدار رسید" کے منافی اور ایک نوع کا علمی سرقہ اور خیانت گردانتا ہے!

اگر یہ نہیں تو کیا صلاح الدین صاحب کا مشورہ یہ ہے کہ ہمیں مولانا مودودی کی کسی بات سے اختلاف نہیں کرنا چاہئے اور ان کو ہر معاملے میں حرفِ آخر یا عقلِ کل تسلیم کر لینا چاہئے۔ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہو تو جو جانتے ہیں وہ تو جانتے ہی ہیں' جو نہیں جانتے وہ بھی کان کھول کر سن لیں کہ یہ معاملہ ہم مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی تو کیا علامہ اقبال کے ساتھ بھی کرنے کو تیار نہیں' جنہیں ہم عہد حاضر میں فکر اسلامی کی تجدید اور تعمیر جدید کے اعتبار سے عظیم ترین شخصیت سمجھتے ہیں اور جن کے آگے دوسرے سب مفکرین و مصنفین ہمیں بونے نظر آتے ہیں' اور ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ خود علامہ مرحوم اپنے مشہور

زمانہ "خطبات" کے دیباچہ میں فرما گئے ہیں کہ :-

"عین ممکن ہے کہ جوں جوں علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کشادہ ہوں 'ان خطبات میں پیش کئے گئے خیالات سے بہتر اور محکم تر خیالات سامنے آئیں" ۔

بہرحال ' ہمیں یقین ہے کہ محمد صلاح الدین صاحب کو اپنی "عاجزانہ اور خیر خواہانہ درخواست" کی یہ دونوں تعبیریں قبول نہیں ہوں گی..... تو پھر اب یا تو وہ خود ہی بتائیں کہ اگر وہ واقعتاً کوئی مخلصانہ مشورہ دینا چاہتے ہیں تو وہ کیا ہے..... اور یا پھر تسلیم کر لیں کہ اس سے اصل مقصود محض گالی دینا تھا!

اس "تیکھی" تمہید کے بعد مدیر "تکبیر" نے چند سطور میں میری "دو گھنٹے کی تقریر کا خلاصہ" درج کیا ہے ' جس میں اس کے علاوہ کہ انتہائی اختصار کے باعث بہت سے اہم نکات کا چھوٹ جانا فطری اور قابل فہم ہے ' غلط بیانی کی کوئی شعوری کوشش نظر نہیں آتی۔ البتہ دو باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔

ایک یہ کہ چونکہ "عورت کی سربراہی" کا مسئلہ اس وقت ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا لہٰذا انہیں میری اس بات کا ذکر بطور خاص کرنا چاہئے تھا کہ میں نے تو خواتین کے پارلیمینٹ کے ممبر بننے کو بھی اسلام کے مزاج کے منافی اور کتاب و سنت کی تعلیمات کے خلاف قرار دیا تھا اور اس سلسلے میں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کا صراحتاً ذکر کرتے ہوئے اس مسئلے میں ان کی "سفارش" سے بھی اظہار براءت کیا تھا۔

دوسرے یہ کہ "اجتہاد بذریعہ پارلیمینٹ" کے مسئلے میں میری رائے کے ضمن میں وہ واقعتاً اور دیانتاً مغالطے میں مبتلا اور خلط مبحث کا شکار نظر آتے ہیں۔ تاہم اس پر گفتگو بعد میں ہوگی!

اس کے بعد آتا ہے مدیر "تکبیر" کی تحریر کا اصل اور "سلگتا ہوا" حصہ 'یعنی میرے اور ان کے مابین سوال جواب کی روداد جس کے ضمن میں بات خود مغالطے میں مبتلا ہونے کے باعث غیر ارادی اور غیر شعوری مغالطہ آمیزی سے بڑھ کر غلط بیانی اور بہتان طرازی کے ذریعے کردار کشی کی ارادی اور شعوری کوشش تک جا پہنچی ہے!

ہم نے یہ الفاظ نہایت درد اور کرب کے ساتھ لکھے ہیں۔ اور اللہ گواہ ہے کہ ہم نے

اس معاملے پر محمد صلاح الدین صاحب کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتے ہوئے اور انہیں اس بات کا بھرپور الاؤنس دیتے ہوئے غور کیا ہے کہ خود ان کے بقول کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں سامعین کی جانب سے جو قہقہے ان کی باتوں پر بلند ہوئے ان میں اپنی تضحیک محسوس کرنے کی بنا پر ان کے حواس بجا نہ رہے ہوں اور جو جوابات میں نے ان کے سوالات کے دیئے اس وقت وہ انہیں سمجھ نہ پائے ہوں..... لیکن ایسے تمام عوامل کو مدنظر رکھنے کے باوجود ہمیں ان کی تحریر نیک نیتی کی حدود سے متجاوز نظر آتی ہے۔ اور صاف نظر آتا ہے کہ کسی اور سبب سے (جس کا علم حتمی طور پر اللہ ہی کو ہے) ان کے دل میں ہمارے بارے میں بغض وعداوت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ۔ "حبک الشی یعمیک و یصم" یعنی تمہارا کسی چیز سے محبت کرنا تمہیں اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے اسی طرح ہماری عداوت نے انہیں ہمارے بارے میں اندھا اور بہرا بنا دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

اس معاملے میں تفصیل میں جانے کی تو اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ' جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' ہم اسی شمارے میں اس مکالمے کی لفظ بلفظ روداد شائع کر رہے ہیں' جسے بھی تفصیلات درکار ہوں وہ خود تقابلی مطالعہ کر سکتا ہے۔ (کاش کہ صلاح الدین صاحب نے بھی اپنی اس تحریر سے قبل اس مکالمے کا ویڈیو دیکھ لیا ہوتا یا کم از کم آڈیو ہی سن لیا ہوتا!)..... البتہ اس پوری بحث کی تان کمال فصاحت وبلاغت کے ساتھ جن الفاظ پر ٹوٹی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہدیہ قارئین کر دیئے جائیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

> "حقیقت یہ ہے کہ اہل دین کو قانون ساز اداروں سے دور رکھنے' ان اداروں کے جو "شوریٰ" کہلاتے ہیں اور قرآن وسنت کے مطابق قانون سازی کے پابند ہیں' ارکان کو علم وکردار کی جملہ شرائط سے مستثنیٰ قرار دینے' اور دو قدم آگے بڑھ کر عورت کو اسلامی ریاست یا حکومت کی سربراہی کا اہل ٹھہرانے اور اس کے لئے ستر وحجاب و دائرۂ کار کی تمام حدود ساقط کر دینے والا مؤقف ایسا ہے جو ہم جیسے واجبی علم اور محدود دینی شعور رکھنے والوں سے ہضم نہیں ہوتا۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی علمی وجاہت' ان کے فہم قرآن وسنت اور ذاتی زندگی میں دین سے ان کے لگاؤ کی کیفیت کو دیکھتے ہیں اور پھر ان کے ارشادات عالیہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو آنکھوں پر وہی کیفیت گزرتی ہے جو چکا چوند روشنی سے اچانک اندھیرے میں جانے یا اندھیرے سے نکل کر تیز روشنی میں آجانے سے طاری ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب

کے مزاج میں بلا کی تندی اور تیزی ہے۔ کسی سمت چلتے ہیں تو پیر صرف ایکسیلیٹر پر رکھتے ہیں' بریک بالکل استعمال نہیں کرتے' دائیں بائیں یا سامنے کے شیشے میں گاڑی کے پیچھے کا منظر بھی نہیں دیکھتے' لوگ پکارتے رہ جاتے ہیں' مگر وہ فراٹے بھرتے' ناک کی سیدھ میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے سرگرم سفر رہتے ہیں۔ انہیں "الھدٰی" پروگرام کے آخری دنوں میں اور اس کی بندش کے موقع پر خواتین کے مسئلہ پر جس رفتار سے ایک سمت میں چلتے دیکھا تھا' اب اسی رفتار سے بالکل الٹی سمت میں چلتے دیکھ رہے ہیں۔ توازن اور اعتدال ان کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا۔ وہ واقعی نہ سیاسی آدمی ہیں' نہ انتخابی۔ خالص انقلابی آدمی ہیں اور کم از کم اپنی ذات کی حد تک ہر وقت حالت انقلاب میں رہتے ہیں۔ اللہ نے انہیں اسٹیم کی طرح علم سے بھر دیا ہے تو اس سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ ان کے اندر ایک ایسا ریگولیٹر بھی مہیا فرما دے' جو اس اسٹیم کو حالت اعتدال پر رکھنے میں ان کی مدد کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب سے ہماری درخواست ہے کہ وہ خود اپنے آپ پر رحم فرمائیں اور اپنی ماضی کی تحریروں کو اپنے موجودہ مؤقف کی وجہ سے ہماری نگاہوں میں بے وقعت نہ بنائیں"۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اپنی اس تحریر میں مدیر "تکبیر" نے جس "تندی و تیزی"—— "آندھی اور طوفان" کی سی برق رفتاری' اور آگے پیچھے' یمین و یسار' اور خطا و صواب سے لاپرواہی کا نقشہ کھینچا ہے' اس سے قطع نظر کہ وہ راقم کی شخصیت پر راست آتا ہے یا نہیں' ان کی اپنی اس بگٹٹ قلم کاری اور خامہ فرسائی پر ضرور منطبق ہوتا ہے...... اور انہوں نے میری ہجو ملیح اور کردار کشی میں اپنی جملہ صحافیانہ صلاحیتوں اور اظہار و بیان کی تمام استعدادات کے ساتھ افتراء اور بہتان سے بھی گریز نہیں کیا۔

اس لئے کہ انہوں نے میرے خلاف اپنے اس قلمی جہاد کی بنیاد جن تین الزامات پر استوار کی ہے ان میں سے ایک کے بارے میں تو میں یہ گمان کر سکتا ہوں کہ انہوں نے میرا مؤقف صحیح طور پر سمجھا نہ ہو اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں' لیکن بقیہ دو تو بدیہی طور پر خالص افتراء اور بہتان پر مبنی ہیں! اور ان کے ضمن میں ان کی بدنیتی اظہر من الشمس ہے!

نیک نیتی کے ساتھ مغالطہ صرف اس معاملے میں ہو سکتا ہے کہ میں اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ کے انتخاب کیلئے رائے دینے کا حق' اور اس کے لئے امیدواری کی اہلیت کی

اساسی شرط صرف "اسلام" کو سمجھتا ہوں۔ گویا کہ میرے نزدیک اسلامی ریاست میں ووٹ کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہے' خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت اور خواہ متقی ہو خواہ فاسق وفاجر' اسی طرح پارلیمنٹ کی رکنیت کی اساسی شرط بھی صرف اسلام ہے' اگرچہ میرے نزدیک خواتین کی اس میں شرکت اسلام کی معاشرتی اور سماجی تعلیمات کی روح کے منافی ہے..... تاہم اس معاملے میں بھی مدیر "تکبیر" کی نیک نیتی صرف اسی اساس پر تسلیم کی جاسکتی ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ وہ مجلس کے خاص حالات میں (جن کی اصل ذمہ داری خود ان ہی پر عائد ہوتی ہے) اتنے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ میری وضاحتوں پر کان ہی نہ دھر سکے! اس لئے کہ میں نے وضاحت کر دی تھی کہ اضافی شرائط کے ضمن میں جیسے ووٹر کی عمر کا معاملہ ہے' جو مختلف جمہوری ممالک میں مختلف ہے اسی طرح تعلیم اور کردار کی اضافی شرائط بھی عائد کی جا سکتی ہیں..... لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہو گا جمہور کی رضامندی سے! (اس لئے کہ دستور مملکت جمہور کی رضامندی ہی سے بن سکتا ہے!)

اسی طرح یہ الزام کہ میں "اہل دین کو قانون ساز اداروں سے دور" رکھنا چاہتا ہوں ایک صریح بہتان ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کے آخری سوال کے جواب میں میں نے شدید حیرت اور تعجب کے ساتھ پوری وضاحت سے ان کے اس الزام سے برأت کا اظہار کر دیا تھا۔ اس معاملے میں ان کی بدنیتی اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اس آخری سوال اور اس کے جواب کا ذکر تک نہیں کیا' حالانکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اپنی مخبوط الحواسی میں وہ میرا جواب نہ سن پائے ہوں تب بھی انہیں اپنا سوال تو یاد رہنا چاہئے تھا۔ اور اگر انہوں نے اپنے ایک ایسے سوال کا ذکر (مغالطہ آمیز انداز میں) کر دیا ہے جو ان کے دل ہی میں رہ گیا تھا اور بالفعل پوچھا نہ جا سکا تھا تو جو سوال بالفعل پوچھا گیا تھا اس کا ذکر تو بدرجہ اولیٰ لازم ہے! الا یہ کہ "دیوانہ بکار خویش ہشیار" کے مصداق اس میں کوئی خاص مصلحت پیش نظر ہو۔

(کاش کہ صلاح الدین صاحب اپنا وہ "اَن پوچھا" سوال پوچھ ہی لیتے..... یعنی یہ کہ "اگر ایوان کی دو تہائی اکثریت آئین تبدیل کر ڈالے تو کیا صورت بنے گی؟"..... اس لئے کہ اس صورت میں مجھے اس اہم نکتے کی وضاحت کا موقع مل جاتا کہ یہی تو علماء کرام' رجالِ دین اور خدّام ملت کے کرنے کا اصل کام ہے کہ عوامی سطح پر ایسی مؤثر وفعال اور چاق وچوبند رائے عامہ اولاً پیدا کریں اور پھر مسلسل برقرار رکھیں جو دستور مملکت میں قرآن وسنت کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی ثبت کرائے اور اسے قائم رکھے۔ باقی رہا علماء کرام کا خود

پارلیمینٹ کا انتخاب لڑ کر اس میں شریک ہونا تو یہ ہرگز اب بھی حرام نہیں..... اور اسلامی ریاست کے بالفعل قیام کے بعد تو فطری اور لازمی طور پر ہو گا ہی! واضح رہے کہ یہ مسئلہ اصلاً اسلامی ریاست کے قیام کے لائحہ عمل اور طریق کار سے متعلق ہے۔ جو اس وقت تو زیر بحث نہیں تھا البتہ میں نے ان محاضرات کے دوران بار بار اعلان کیا تھا کہ اس موضوع پر میں اپنا نقطہ نظر اسی مقام پر ۴ر جنوری ۸۹ء کو پیش کروں گا..... میرے نزدیک اس وقت ہم عملاً جس مرحلے میں ہیں یعنی "اسلامی نظام کے قیام کی کوشش" اس کے لئے کرنے کا اصل کام مقدّم الذکر ہے، جس کیلئے ایک انقلابی جدوجہد درکار ہے، اگرچہ حرام مؤخر الذکر بھی نہیں ہے اور جو لوگ نیک نیتی سے اسی کو مفید مطلب سمجھتے ہوئے اس میں جان و مال صرف کر رہے ہیں انشاء اللہ العزیز وہ بھی عند اللہ ماجور ہوں گے۔)

رہی تیسری بات..... یعنی "عورت کو اسلامی ریاست اور حکومت کی سربراہی کا اہل ٹھہرانے اور اس کے لئے ستر و حجاب اور دائرہ کار کی تمام حدود ساقط کر دینے" کا الزام تو اس پر تو بے ساختہ سورۂ مریم کے آخر میں وارد شدہ الفاظ مبارکہ نوک قلم پر آ گئے ہیں۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ○ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ○ (آیات ۸۹، ۹۰) ترجمہ۔ "یہ تو تم نے بہت ہی سنگین بات کہہ دی ہے۔ اس سے تو قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہو جائیں!"..... حیرت ہوتی ہے کہ ایک ماہ سے بھی کم عرصہ قبل اپنی ایک تحریر میں دو مرتبہ یہ شہادت دینے کے بعد کہ میں عورت کی سربراہی کو "منکر" سمجھتا ہوں لیکن موجودہ حالات میں قومی و ملکی مصلحتوں کے پیش نظر دوسرے بہت سے منکرات کی طرح اسے بھی مجبوراً صرف گوارا کرنے کا قائل ہوں ــــ اور خود بھی اسی مؤقف کی تائید کرنے کے بعد ــــ مدیر تکبیر کی نظر سے میرا وہ کون سا فتویٰ گزرا ہے جس کی بناء پر انہوں نے اتنا بڑا الزام لگا دیا اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس افتراء اور کذب صریح پر سب و شتم کے بگٹٹ گھوڑے دوڑانے میں اپنی طلاقت لسانی اور شوخ بیانی کی پوری صلاحیت و استعداد صرف کر دی۔ ملک میں مذہبی صحافت کے "میر کارواں" کی اس "جسارت" پر ناطقہ سر بگریباں ہے کہ ع "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!" کی شاباش دی جائے یا ع "چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!" کا ماتم کیا جائے!

مدیر تکبیر کو اگر موت کا کچھ بھی خیال ہے، اور بعث بعد الموت اور محاسبہ اخروی پر کسی

بھی درجے میں ایمان ہے تو ان کے لئے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بھی استغفار کریں اور ان سطور کے عاجز راقم سے بھی علیٰ رءوس الاشہاد معافی مانگیں۔ اس پر وہ اللہ تعالیٰ کو بھی تواب اور رحیم پائیں گے..... اور ان شاء اللہ اس ناچیز کو بھی اپنا پہلے ہی جیسا نیاز مند پائیں گے.....
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

رہا مستقبل کی اسلامی ریاست میں قانون سازی کے حدود وقیود اور اس کے ضمن میں اجتہاد کا مسئلہ..... تو یہ میدان صحافتی انداز کی قلم کاری کے جوہر دکھانے کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ موضوع بہت سنجیدہ سوچ بچار اور بحث وتمحیص کا متقاضی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس پر بڑے سائز کے ڈھائی صفحات پر پھیلی ہوئی طویل تحریر کے ذریعے مدیر "تکبیر" نے اسے الجھایا ہی ہے سلجھایا نہیں۔ بلکہ "فاش تر گویم" کے مطابق صحیح تر بات تو یہ ہے کہ وہ اصل مسئلے کو سمجھے ہی نہیں تو سلجھائیں گے کیا۔

اس معاملے میں بحث چونکہ علامہ اقبال مرحوم کے معرکۃ الآرا اور شہرۂ آفاق "خطبات" کے گرد گھومتی ہے' لہٰذا اصل مسئلے پر گفتگو سے قبل مناسب ہے کہ وضاحت کر دی جائے کہ راقم کو اس معاملے میں کسی سنی سنائی سند کی احتیاج نہیں ہے' میری اپنی ذاتی رائے' جو میں نے آج سے ۲۱ سال قبل اپنی اس تحریر میں ظاہر کی تھی جو اب "اسلام کی نشاۃ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام" کے نام سے شائع ہوتی ہے اور جسے راقم اپنی پوری عملی جدوجہد کے ضمن میں اساسی دستاویز قرار دیتا ہے' حسب ذیل ہے۔

> "آج سے پینتیس چالیس سال قبل علامہ اقبال مرحوم نے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصہ تو اگرچہ بہت محل نظر ہے جو شریعت وقانون اور اجماع واجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع "الٰہیات" سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی!"

(واضح رہے کہ "خطبات" کے اس حصے کو بھی راقم نے صرف فکر انگیز مانا ہے' حرف آخر یا منزہ عن الخطاء' نہیں' اس لئے کہ ان کے متکلمانہ مباحث کے بھی بعض نکات سے راقم کو شدید اختلاف ہے..... اگرچہ اس سب کے باوصف راقم علامہ مرحوم کو عہد حاضر

میں تجدید فکر اسلامی کے میدان کی عظیم ترین شخصیت 'اور ان کے "خطبات" کو تاحال اس موضوع پر اہم ترین کتاب مانتا ہے۔)

تاہم "اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ" کے مسئلے پر علامہ مرحوم کی رائے کو راقم صدفی صد درست سمجھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ع "سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست!" کے مصداق کم فہم لوگ اسے الجھا کر رکھ دیں۔

اس معاملے میں خلط مبحث دو جدا بحثوں کو گڈمڈ کر دینے سے ہوتا ہے۔ ایک بحث ہے اجتہاد کے اصول 'اس کے حدود و قیود 'اور اس کی اہلیت کے لوازم و شرائط کی 'اور دوسری بحث ہے ایک جدید اسلامی ریاست میں قوت نافذہ کی کہ وہ کس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ میرے ۲۰ر دسمبر ۸۸ء کے محاضرہ کے موضوع سے متعلق بحث دوسری تھی نہ کہ پہلی! اور یہ تو ہرگز باور نہیں کیا جا سکتا کہ مدیر "تکبیر" ان دونوں کے فرق کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب کوئی شخص مخالفت برائے مخالفت کا فیصلہ ہی کر لے تو عقل عمومی (COMMON SENSE) بھی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے!

اب یہ بات تو علم سیاسیات کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ بادشاہت (MONARCHY) میں یہ قوتِ نافذہ ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے' تھیا کریسی (THEOCRACY) میں یہ اختیار ایک مذہبی طبقے کو حاصل ہوتا ہے اور جمہوریت (DEMOCRACY) میں عوام کے نمائندوں کو! لیکن اصل سوال یہ ہے کہ عہد حاضر کی اسلامی ریاست اگر دین اور جمہوریت کے امتزاج سے وجود میں آئے گی' جیسے کہ خود صلاح الدین صاحب نے اتفاق کیا ہے کہ وہ ایک " THEO-DEMOCRACY " ہے تو قانون سازی اور تنفیذ قانون کا اختیار کس کے ہاتھ میں ہو گا؟...... اصل میں اس سوال کا جواب ہے جو علامہ اقبال مرحوم نے دیا ہے کہ یہ اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہو گا۔ اور یہ بات صدفی صد درست ہے!

اس پر ذہن میں اشکالات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ جدید اسلامی ریاست کے دوسرے اعضاء (ORGANS) اور ان کے عمل دخل کے بارے میں ذہن واضح نہیں ہیں۔ اور اگر محترم صلاح الدین صاحب ایک خاص ذہن لے کر محاضرات میں شریک نہ ہوتے تو انہیں جملہ اشکالات کا حل مل جاتا۔ لیکن ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"

اب یہاں ہمارے لئے اپنی سوا دو گھنٹے کی پوری تقریر نقل کرنا تو ممکن نہیں ہے لیکن

زیر بحث موضوع سے متعلق چند بنیادی نکات درج ذیل ہیں۔

۱۔ عہد حاضر کی اسلامی ریاست صرف اس وقت قائم ہو سکے گی جب کسی ملک کے رہنے والوں میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا زبردست داعیہ پیدا ہو جائے اور یہ داعیہ اپنے آپ کو ایک مؤثر رائے عامہ کی صورت میں، خواہ بطریق انتخاب خواہ بطریق انقلاب، بروئے کار لے آئے یعنی بالفعل ASSERT کرائے اور تسلیم کرالے!

۲۔ اس کا عملی آغاز اس طرح ہو گا کہ مملکت کے دستور اساسی میں غیر مشروط طور پر اور بلا استثنا طے کر دیا جائے گا کہ "یہاں کوئی قانون سازی قرآن اور سنت کے منافی نہیں کی جا سکتی!"

۳۔ ملک کی مقننہ اور انتظامیہ کو دستور کا پابند رکھنے کی ذمہ داری عدلیہ کی ہوتی ہے، لہٰذا جس طرح ملک کی عدالت ہائے عالیہ دستور میں طے شدہ حقوق شہریت کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہیں اور شہریوں کو انتظامیہ کی دستبرد سے بچاتی ہیں، اسی طرح مقننہ کو قانون سازی سے متعلق اس دفعہ کا پابند رکھنا بھی اسی کی ذمہ داری ہوگی..... اور اگر کسی شہری کو گمان ہو کہ مقننہ نے کسی معاملے میں اس دفعہ کی خلاف ورزی کی ہے اور قرآن و سنت کی حدود سے تجاوز کیا ہے تو اسے حق حاصل ہو گا کہ عدالت کا کنڈا کھٹکھٹائے..... اور عدالت کو اختیار ہو گا کہ اگر یہ بات درست ثابت ہو تو ایسے کسی بھی قانون کو غیر مؤثر قرار دے دے! اس بات کی وضاحت کی حاجت نہیں ہے کہ عدالت میں اپنے مؤقف کے حق میں دلائل پیش کرنے کا حق ہر شہری کو حاصل ہو گا۔ عام اس سے کہ وہ عالم ہو یا عامی! (رہی یہ استثنائی مگر امکانی صورت حال کہ کسی وقت مقننہ اور انتظامیہ باہمی تعاون سے دو تہائی یا تین چوتھائی اکثریت سے اس دفعہ کو منسوخ کر دیں..... یا عدلیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کے ذریعے اس کی کوئی من مانی تاویل کر کے اسے غیر مؤثر کر دیں تو یہ صورت ایک "جوابی انقلاب" (COUNTER REVOLUTION) کی ہوگی جس کے مقابلے کے لئے عوام کی عدالت ہی سے رجوع کیا جائے گا..... اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا کہ دوبارہ رائے عامہ کے مؤثر اظہار کی کوئی مناسب صورت اختیار کی جائے!)

۴۔ رہا نئے پیش آمدہ مسائل و معاملات کے ضمن میں اجتہاد تو اس کے اصول و حدود، اور شرائط و لوازم کو تعلیم و تلقین کے ذریعے تو عام کیا جائے گا۔ لیکن آزادانہ غور و فکر اور اظہار رائے پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہوگی۔ ارباب علم و فہم اور اصحاب دانش و بینش کا فرض ہو گا کہ اجتہاد کے ضمن میں جملہ حدود و قیود کو ملحوظ رکھتے ہوئے پوری کدو کاوش کریں..... البتہ یہ بات

کہ کونسا اجتہاد قانون ملکی کی شکل اختیار کر کے نافذ العمل ہو گا' اس کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی۔ جس کے سر پر یہ تلوار بہرحال لٹکی رہے گی کہ اگر اس کا اختیار کردہ "اجتہاد" قرآن و سنت کے نصوص کے خلاف ثابت ہوا تو وہ کالعدم ہو جائے گا اور اس کی ساری محنت رائیگاں جائے گی۔

۵۔ اس پورے خاکے میں' جس کے جملہ اجزاء لازمی بھی ہیں اور باہم دگر ایک حیاتیاتی اکائی کے مانند مربوط بھی' علماء دین اور حامیان شرع متین' اور دوسرے خدّام و فدائیان دین کے کرنے کے کام چار ہیں۔ (ا) اسلام کے حق میں ایک مضبوط' فعال اور مؤثر رائے عامہ کو بروئے کار لانا..... اور اسے برقرار رکھنا۔ (ب) عوام میں کتاب و سنت کے صحیح فہم کو ایک مؤثر حد تک برقرار رکھنا تاکہ وہ مادر پدر آزاد مفکرین اور خود ساختہ متجدد دین و مجتہدین کے گمراہ کن افکار و نظریات سے متأثر نہ ہوں۔ (ج) عدالتوں کو نزاعی معاملات میں کتاب و سنت کے مطابق صحیح فیصلوں تک پہنچنے میں بھرپور (اور بلا معاوضہ) مدد دینا..... اور (د) خود پارلیمنٹ میں بھی شریک ہونا اور عدلیہ میں بھی شامل ہونا۔ (لیکن ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ میں ان کی شمولیت کا دارومدار ووٹوں پر ہو گا..... اور عدلیہ میں شرکت کا انحصار اہلیت پر!)

دراصل یہ اسی بالفعل (DE FACTO) قوت نافذہ اور بالحق (DE-JURE) کتاب و سنت کی پابندی کی علیحدہ علیحدہ وضاحت کی کوشش تھی جس کے ضمن میں راقم نے امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے طرزِ عمل'..... اور پھر اورنگ زیب عالمگیر اور ان کے زیر ہدایت مرتب ہونے والے فتاویٰ کا ذکر کیا تھا..... جس میں مدیر "تکبیر" نے خواہ مخواہ قاضی ابو یوسفؒ کا ذکر چھیڑ کر کج بحثی کی صورت پیدا کر دی۔ اس مسئلے کو ذرا کھول کر بیان کیا جائے تو بات یوں سامنے آئے گی:۔

ا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران ایک شدید جانگسل انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں جب اسلامی ریاست وجود میں آئی تو چونکہ حاکم حقیقی یعنی اللہ جل جلالہ کے نمائندے (گویا کتاب و سنت کے ترجمان مطلق) بھی آپؐ ہی تھے اور قوت نافذہ بھی بالکلیہ آپؐ ہی کے دست مبارک میں تھی۔ لہٰذا کوئی الجھن سرے سے موجود ہی نہ تھی!

۲۔ خلافت راشدہ کے دوران بھی دین و مذہب اور ریاست و سیاست کی یہ وحدتِ کاملہ اس طرح برقرار رہی کہ ایک جانب خلیفہ راشدؓ بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف کی بنیاد پر قوت نافذہ پر پوری طرح متصرف ہوتے تھے تو دوسری جانب خود وہ اور جملہ اربابِ حل و عقد اور تمام

اصحابِ شوریٰ مجتہدین مطلق کے مقام پر فائز تھے! رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم اجمعین!

۳- اصل مسئلہ دور ملوکیت میں پیدا ہوا کہ حکومت کی اساس قبائلی عصبیت پر قائم ہوتی تھی اور قوت نافذہ کسی خلیفہ یا ملک یا سلطان کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو درجہ اجتہاد کے نہ اہل تھے نہ مدّعی..... بلکہ اس کے مقر اور معترف تھے کہ اس کے اہل دوسرے ائمہ یا علماء ہیں۔ اس دور کے اول و آخر کی چند مثالیں تو میں نے دی تھیں 'ایک مثال بطرز استفہام انکاری مدیر "تکبیر" نے پیش فرمائی تھی..... ان کے معاملے کو علیحدہ علیحدہ سمجھ لیا جائے

(ا) امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کو نہ صرف یہ کہ قضا کا عہدہ پیش کیا گیا بلکہ ان پر اس کو قبول کرنے کے لئے شدید دباؤ ڈالا گیا۔ حتیٰ کہ قید و بند کی صعوبتوں کی نوبت بھی آ گئی لیکن وہ انکار پر مصر رہے..... اس کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ وہ اس حکومت ہی کو صحیح نہ سمجھتے ہوں۔ بنابریں اس کے ساتھ کسی بھی صورت میں تعاون نہ کرنا چاہتے ہوں۔ (جس کے قوی شواہد موجود ہیں) دوسرے یہ کہ فرطِ تقویٰ اور شدّت خشیت کی بنا پر وہ اُس ذمہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کند چھری سے ذبح کئے جانے سے تعبیر کیا تھا..... اور تیسرے یہ کہ ان کی رائے یہ ہو کہ ابھی فقہ اسلامی کی تدوین کے کام کا آغاز ہے 'اور ضرورت ہے کہ آزادانہ غور و فکر اور اظہار رائے کی فضا بہ تمام و کمال قائم رہے۔ جبکہ قضا کا عہدہ قبول کرنے میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ ان کے ذاتی اجتہادات عدالتی نظائر کی حیثیت سے مستقل اور دائمی قانون کی صورت اختیار کر لیں۔ میرے نزدیک یہ آخری احتمال سب سے زیادہ قرین قیاس ہے..... واللہ اعلم بالصواب!!

(ب) امام مالکؒ نے تو اپنے اجتہادات کو کتابی صورت بھی دے دی تھی (مؤطا امام مالکؒ) اور حکومت وقت کی پیشکش یہ تھی کہ اسے کتابِ قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے 'انہوں نے بھی اسے رد کر دیا اور شدید ترین تعذیب کو برداشت کرنے کو ترجیح دی۔ ان کے معاملے میں بھی متذکرہ بالا تین احتمالات میں سے اول و آخر دونوں کا پورا امکان موجود ہے!

(ج) البتہ قاضی ابو یوسفؒ نے قضا کا عہدہ قبول کر لیا۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کوئی وقتی (لیکن دینی و ملّی نہ کہ ذاتی) مصلحت ملحوظ رکھی ہو..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک چونکہ تدوین فقہ اسلامی کا ابتدائی کام مکمل ہو چکا تھا 'لہٰذا تیسرا احتمال یا تو سرے سے باقی نہیں رہا تھا یا اس کی شدت میں کمی آ گئی تھی!

(د) اورنگ زیب عالمگیرؒ بھی "شہنشاہ" تھے اور ہیئت حاکمہ اور قوت نافذہ پر بہ تمام و کمال متصرف'..... اور وہ چونکہ سُنّی اور حنفی تھے لہٰذا انہوں نے حنفی علماء میں سے جن کے علم و فہم دین اور تقویٰ و تدیّن پر انہیں اعتماد تھا ان کا بورڈ تشکیل دے دیا..... اور اس طرح فتاوائے عالمگیری' مرتب ہو گئے جنہیں بادشاہِ وقت نے نافذ کر دیا!

۴۔ عہد حاضر میں ایک حقیقی اسلامی ریاست کا نقشہ تو ان پانچ اصولوں پر استوار ہو گا جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اب یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ وہ کب اور کس خطے کے مسلمانوں کو اس کی توفیق ارزانی فرماتا ہے کہ وہ اس کے لئے "منہج انقلاب نبویؐ" کے خطوط پر انقلابی جدوجہد برپا کر سکیں..... فی الوقت سعودی عرب میں جو نظام قائم ہے اس کی اساس دین اور سیاست کی وحدت نہیں' ثنویت پر قائم ہوئی تھی۔ اس لئے یہ حکومت آل سعود اور آل شیخ (محمد ابن عبدالوہابؒ) کی مشترکہ جدوجہد سے قائم ہوئی تھی اور اس میں یہ باہمی تقسیم طے ہو گئی تھی کہ حکومت بالکلّیہ آل سعود کے ہاتھ میں رہے گی اور مذہبی معاملات آل شیخ کے حوالے رہیں گے! (اب اس پر آل شیخ کی اجارہ داری ختم ہو چکی ہے اور امور شرعیہ شاہی خاندان کے معتمد علیہ علماء کے حوالے ہیں)..... یہی صورت حال خلیج کی ان بعض امارات میں ہے جہاں مذہبی مزاج کے حامل لوگ برسر اقتدار ہیں..... رہا ایران تو وہاں "اسلامی انقلاب" کے بعد جو نظام قائم ہوا ہے اس میں مذہب اور سیاست یکجا تو ہو گئے ہیں لیکن بہ طریق تھیا کریسی!! جس کے لئے اہل تشیع کے تصور امامت معصومہ میں تو نیابت کے اجتہادی اضافے کی اساس پر گنجائش نکالی جا سکتی ہے لیکن اہل سنت کے تصور خلافت کے ساتھ اس کی کوئی پیوند کاری ممکن نہیں!..... گویا معاملہ وہی ہے جو علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

"نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!"

رہا پاکستان' تو یہاں آغاز تو نہایت صحیح رخ پر ہوا تھا' یعنی دستور ساز اسمبلی پر عوامی مطالبے کا دباؤ ڈال کر' جس میں اس وقت کے جملہ فعال مذہبی عناصر کی مساعی شامل تھیں' اس کی زبان سے "قرارداد مقاصد" کا کلمہ شہادت ادا کر لیا گیا..... لیکن افسوس کہ اس کے بعد مذہبی جماعتوں نے خود انتخابی سیاست کے اکھاڑے میں اتر کر ایک جانب اسلام کو نزاعی مسئلے بلکہ انتخابی نعرے کی حیثیت دے دی اور دوسری جانب خود باہم دست و گریبان ہو کر ایک دوسرے کو NEUTRALISE کر دیا..... چنانچہ رفتہ رفتہ وہ سب کی سب غیر مؤثر ہو کر رہ گئیں۔

اور ان کی حقیقی اور واقعی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ رہی کہ مختلف اور متحارب لادینی قوتوں کی باہمی کشمکش اور سیاسی محاذ آرائی میں پاسنگ یا ضمیمہ کا کام دیں..... یا وقتاً فوقتاً متحدہ سیاسی مہموں کے غبارے میں مذہبی جذبہ کی ہوا بھرنے کی خدمت سرانجام دیں..... نتیجۃً آج ملک وقوم اس کیفیت سے دوچار ہیں ع "کہ رہوارِ یقین مابصحرائے گماں گم شد!" ..... فاعتبروا یااولی الابصار!!

جب گفتگو اس مقام تک پہنچ ہی گئی ہے تو لگے ہاتھوں اس اہم نکتے کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ بحالات موجودہ اسلام کے سیاسی اور ریاستی نظام کے موضوع پر گفتگو میں ایک غلط مبحث اس بنا پر بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اصولی بحث کرتے کرتے لوگ اچانک اس کا جوں کا توں انطباق موجود الوقت حالات پر کرنے لگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ کہاں ہمارا موجودہ مسلمان معاشرہ اور کہاں اسلامی ریاست' ع "چہ نسبت خاک را باعالم پاک!" ..... اس غلط مبحث کے نتیجے میں اسلامی ریاست کی بحث وقتی سیاسی محاذ آرائیوں اور چپقلشوں کے خارزار میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے جس سے مدیر "تکبیر" اس وقت شدت کے ساتھ دوچار ہیں!..... یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ہے کہ اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کی پوری گفتگو فی الوقت صرف علمی و نظری نوعیت کی ہے' جس کا زمینی حقائق و واقعات کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں!..... ان سطور کے راقم کو اس بات پر تو ایمان بھی حاصل ہے اور یقین بھی کہ پورے کرہ ارضی پر ایک عالمی اور مثالی اسلامی ریاست قائم ہو کر رہے گی۔ اور ایک گمان (یا خوش فہمی؟) یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز مملکت خداداد پاکستان ہی سے ہو گا..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ ابھی ہم اس سے بہت دور ہیں اور ایک طویل جدوجہد اور جانگسل محنت و مشقت بلکہ آگ اور خون کے بہت سے دریا راستے میں حائل ہیں! اور بڑے ہی دل گردے کے مالک اور ہمت و عزیمت کے پیکر مجسم ہوں گے وہ لوگ جو یہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس کے لئے کمر ہمت کس لیں!..... اسلامی ریاست کے قیام کے آرزومندوں اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے خواہشمندوں کو جان لینا چاہئے کہ فی الوقت اصل ضرورت ایسے صاحب عزیمت لوگوں کی تلاش اور انہیں کسی مضبوط تنظیمی ڈھانچے کی صورت میں بنیان مرصوص بنانے کی ہے۔

"میں کہ مری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!"

(۲)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک "من لم یشکر الناس لا یشکر اللہ" کی رُو سے سخت ناشکری ہوگی اگر اُن احباب اور بزرگوں کا تذکرہ نہ کر دیا جائے جنہوں نے اس بار حرمین شریفین میں راقم الحروف کا اعزاز و اکرام فرمایا، اور مہمان نوازی کی۔

مکہ مکرمہ کی صد سالہ قدیم درسگاہ مدرسہ صولتیہ کے ناظم مولانا محمد مسعود شمیم صاحب نے جس محبت کے ساتھ راقم کا خیر مقدم کیا اور مدرسہ کے تمام شعبوں کا معائنہ کرایا۔ اور متعدد بیش قیمت کتابیں ہدیہ فرمائیں، اس کا دل پر بہت اثر ہے۔ اس پر مستزاد مدرسہ صولتیہ ہی میں تدریسی خدمات سرانجام دینے والے نوجوان عالم دین مولانا سیف الرحمٰن صاحب نے جو حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی مدظلہ کے اعزّہ میں سے ہیں اپنے مکان پر پرتکلف دعوتِ طعام کا اہتمام فرمایا جہاں مدرسہ کے بعض دوسرے اساتذہ کے علاوہ پاکستان سے عمرہ وغیرہ کے لیے آنے والے متعدد علماء کرام سے ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا۔

اسی طرح مولانا محمد خیر محمد حجازی نے بھی، جو اپنے حرم پاک کے دروس کے لیے مشہور ہیں اور شیخ مکی کے مختصر نام سے معروف ہیں، بہت محبت اور اصرار کے ساتھ کھانے کی دعوت دی اور ناچیز کا اعزاز و اکرام فرمایا۔

مولانا اختر ہاشمی صاحب کی محبت اور شفقت نے بھی دل پر بہت اثر کیا۔ وہ ہمارے استقبال کے لیے ہمارے پہنچنے سے قبل ہی ریاض سے جدّہ پہنچ گئے تھے اور پھر اس کے باوجود کہ مکہ مکرمہ میں ان کے بہت سے احباب کے علاوہ قریبی اعزّہ بھی موجود ہیں وہ مسلسل ہمارے ہی ساتھ رہے ——— اور اس طرح اُن کے ساتھ بہت سے علمی و سیاسی موضوعات پر مفید مذاکرہ رہا ——— اسی طرح خواجہ امان اللہ صاحب نے بھی بہت کرم فرمایا کہ صرف ملاقات کے لیے ریاض سے مکہ مکرمہ تشریف لاتے اور دو تین روز تک کافی وقت ساتھ گزارا۔

الریاض اور الواسع کے رفقاءِ تنظیم اسلامی کی ہمت تو قابل رشک ہے۔ بیس بائیس حضرات پر مشتمل اس قافلے نے جمعرات کی سہ پہر کو الریاض سے سفر کا آغاز کیا۔ تقریباً بارہ گھنٹے کے سخت

تھکا دینے والے سفر کے بعد رات کے پچھلے پہر مناسکِ عمرہ سے فراغت حاصل کی، پھر قبل از نماز جمعہ ——— اور بعد از نماز جمعہ دو طویل نشستوں میں میرے ساتھ شامل رہے اور پھر جمعہ ہی کی شام کو اس نیّت کے ساتھ واپس روانہ ہو گئے کہ ہفتہ کی صبح کو اپنے اپنے کاموں پر حاضر ہونا ہے ——— ! ان سب کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے ——— اور میں ان سب کی ہمّت و عزیمت پر ان کی خدمت میں ہدیۂ سلام پیش کرتا ہوں۔

جناب فاروق چشتی کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ ان کی مہمان نوازی کا نقش راقم کے قلب پر تادیر قائم رہے گا۔

مدینہ منوّرہ میں چودھری محمد جمیل صاحب نے جس محبّت و شفقت کا اظہار فرمایا۔ اس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ چودھری صاحب کراچی کے فردوس ہوٹل کے حوالے سے ایک معروف مخیّر شخصیّت ہیں۔ پاکستان میں ایک خاتون کے سربراہِ حکومت بن جانے سے وہ بہت ناخوش ہیں، اور اسی بنا پر 'ہجرت' کی نیّت سے مدینہ منوّرہ میں ڈیرا جمایا ہے ——— آگے جو اللہ کو منظور!!۔

جدّہ کے احباب میں سے محمد اصغر حبیب، فیض اللہ ملک اور سیّد افتخار الدین اور بعض دوسرے رفقاءِ تنظیم کے ذکر کی تو کوئی احتیاج نہیں اس لیے کہ وہ میرے اپنے دست و بازو' ——— اور حقیقی بھائیوں اور بیٹوں کی مانند ہیں ——— البتہ محترم یحییٰ عبدالشکور منشی صاحب کا ذکر لازم ہے کہ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنا ایک آراستہ پیراستہ 'شقّہ' ہمارے حوالے کیے رکھا ——— اور ہمیں ہر طرح سے آرام پہنچانے کی کوشش کی اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اُن کے خلوص و اخلاص اور محبّت و شفقت کی بھرپور جزا عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

جدّہ میں ایک مفصل ملاقات برنی برادران سے بھی ہوئی جس کا ذکر ایک خاص اعتبار سے ضروری ہے۔ یہ دونوں بھائی، ڈاکٹر شجاعت حسین برنی، اور ڈاکٹر فرحت حسین برنی، جدید فنّی تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں رکھنے کے ساتھ ساتھ (ڈاکٹر شجاعت معالجہ امراضِ نفسیاتی

ہیں ڈاکٹریٹ کے حامل ہیں اور ڈاکٹر فرحت انجینئرنگ میں، نہایت نیک طبیعت اور گہرے مذہبی مزاج کے حامل ہیں، ـــــ اور دونوں ہی نے نہایت قلیل مدت میں قرآن مجید کے ساتھ گہرے شغف کے علاوہ درس قرآن کی عمدہ صلاحیت حاصل کر لی ہے!

ان میں سے فرحت صاحب کی جماعتِ اسلامی کی تحریک کے ساتھ وابستگی نہایت گہری اور جذباتی ہے، ـــــ اور وہ غالباً اس وقت جماعت کے جدّہ کے حلقے کے سربراہ ہیں!

انہوں نے اثناءِ گفتگو میں نہایت حسرت کے ساتھ کہا کہ آپ کو جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا! اور جب میں نے عرض کیا کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ خود علیحدہ نہیں ہوئے تھے، ـــــ بلکہ ہمیں جبراً علیحدہ کیا گیا تھا۔ اور حالات ایسے پیدا کر دیئے گئے تھے کہ اگر ہم جماعت سے علیحدہ نہ ہوتے تو ہماری معنوی موت واقع ہو جاتی، اس لیے کہ اجتماع ماچھی گوٹھ (فروری ۱۹۵۶ء) میں طے یہ پایا تھا کہ جو لوگ جماعت کی موجودہ پالیسی سے اختلاف رکھتے ہوں وہ اپنی رائے کا اظہار نہ تحریری طور پر کر سکتے ہیں ـــــ نہ زبانی طور پر، ـــــ انہیں صرف جماعت کے کل پاکستان اجتماعِ ارکان میں اظہارِ رائے کا حق حاصل ہوگا ـــــ اس کے علاوہ نہ وہ جماعت کے مقامی یا حلقہ وار اجتماعات میں اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گے نہ ارکانِ جماعت سے نجی گفتگوؤں میں! ـــــ اور ارکان کے کل پاکستان اجتماع کے بارے نہ یہ یقینی ہوتا ہے کہ وہ کتنے وقفے کے بعد ہو سکے گا۔ نہ ہی اس میں کسی اختلافی نقطۂ نظر کو تفصیلاً پیش کرنے کا موقع یا محل ہوتا ہے! ـــــ گویا جماعت اسلامی میں اظہارِ رائے کی آزادی ہاتھی کے ان دانتوں کے مانند ہے جو دیکھنے میں تو بہت بڑے بڑے نظر آتے ہیں لیکن کھانے کے کام نہیں آسکتے!!

اس پر جس حیرت اور تعجب کا اظہار برنی صاحب نے کیا اس پر خیال آیا کہ جماعتِ اسلامی کی تاریخ کے اس گمشدہ باب کو اب منظرِ عام پر لے ہی آنا چاہیے جو ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۸ء کے واقعات پر مشتمل ہے اور جس کا ایک اہم حصّہ راقم نے بائیس سال قبل ۱۹۶۶-۶۷ء میں 'نقضِ غزل' کے عنوان سے تحریر بھی کر دیا تھا اس لیے کہ اس کے بغیر جماعت کے بہی خواہوں پر ہمارا موقف صحیح طور پر واضح نہیں ہو سکتا ـــــ اور ویسے بھی ان حوادث پر اب تیس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے ـــــ اور اتنے عرصے کے بعد تو دنیا میں حسّاس ترین دستاویزات کو بھی شائع

کر دیا جاتا ہے ـــــــ تاکہ حقائق و واقعات کا علم صفحۂ ہستی سے بالکل گم ہی نہ ہو جائے اور بعد میں آنے والے لوگ ماضی کے حوادث کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکیں اور مستقبل کے بارے میں صحیح فیصلے کر سکیں ـــــــ اس پر یہ بھی یاد آیا کہ یہ فیصلہ ہم نے تقریباً ایک سال قبل کر بھی لیا تھا لیکن پھر دوسری مصروفیات مانع ہوتی رہیں۔

بہرحال اب قارئین 'میثاق' نوٹ فرمالیں کہ 'میثاق' کی آئندہ اشاعت بابت مارچ ۸۹ء میں 'نقضِ غزل' کی وہ پانچ قسطیں یکجا شائع کر دی جائیں گی جو ۶۷-۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھیں اور انشاء اللہ اپریل کے پرچے میں اس کی تکمیل کر دی جائے گی۔ واللہ الموفق والمستعان!

سہ لسانی، سہ ماہی **تفکّر** کا پہلا شمارہ

معلّم اور صحافی **شبّیر بخاری** کی ادارت میں

اِن شاءَ اللہ تعالیٰ فروری ۱۹۸۹ء میں منظرِ عام پر آجائے گا

ـــــــ اس مجلّے میں ـــــــ

تفکّر فی القرآن، تفکّر فی الحدیث، افکارِ صحابہؓ، اخلاق و تصوف، ادب و فلسفہ، تعلیم و تعلّم، سائنس و ٹکنالوجی، تاریخ و سیاست، سیاحت و ثقافت، معیشت و تجارت، صحت و ثبات، دفاع و عسکریات، شخصیات، اخبارات وغیرہ مختلف عنوانات کے تحت گوناگوں مفید قومی فکری جہتوں کا احاطہ کیا گیا ہے

اہلِ فکر و دانش ابھی سے اپنی کاپی محفوظ کرانے کا اہتمام فرمائیں۔

سالانہ زرِ تعاون:- ۵۰ روپے

مقامِ اشاعت: ۵۲۳ جہانزیب بلاک (مخدوم جہانیاں اکیڈمی) علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور ۱۸

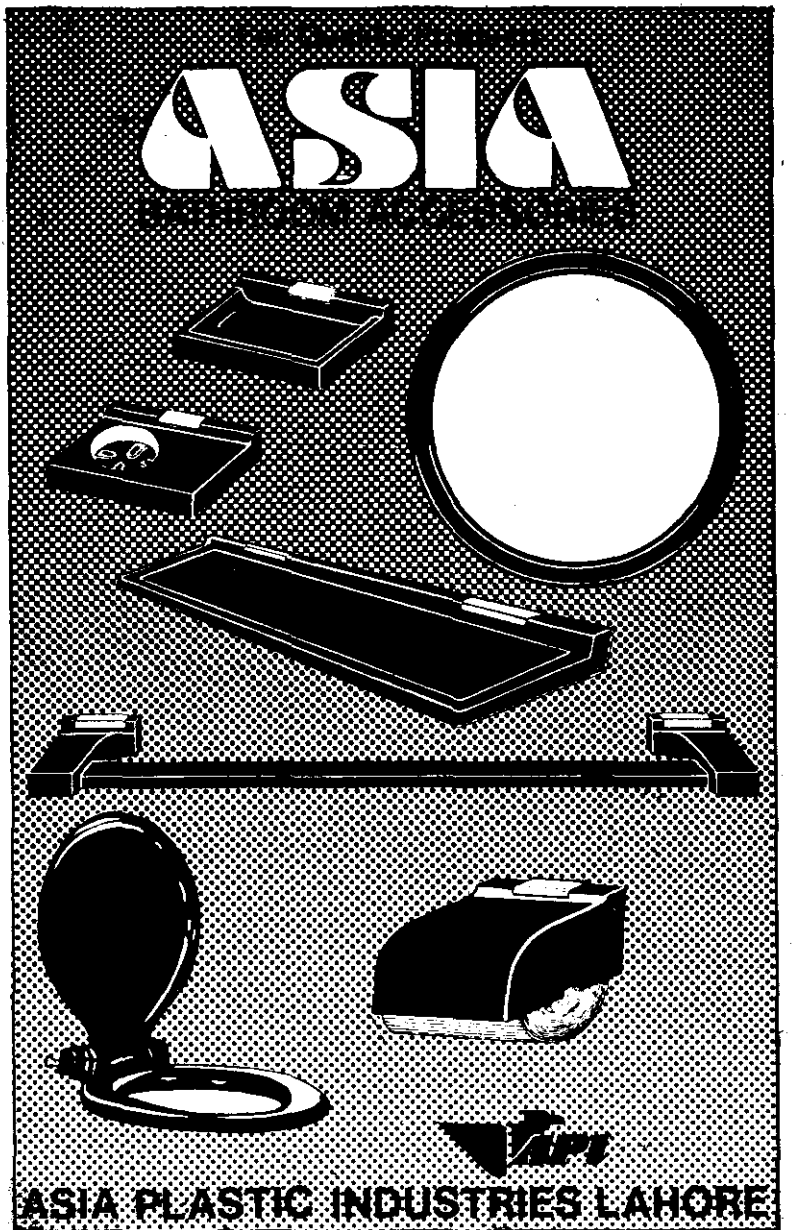

ASIA
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

حدیثِ رسولؐ

وَعَنْ

عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ

قَالَ: بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ

فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ

وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا

وَاَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ

مِّنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ،

وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ

لَوْمَةَ لَائِمٍ (بخاری و مسلم)

مفہوم: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ:

ہم ہر حالت میں اللہ اور رسول اور اُن لوگوں کی جن کو امیر مقرر کیا گیا ہو بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ خواہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی اور خوشی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی اور اُس صورت میں بھی جب کہ دوسروں کو ہمارے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہو۔ امیر سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے کہ امیر سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو۔ اُس وقت ہمارے پاس دلیل ہوگی کہ ہم اُس کی بات نہ مانیں اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

الداعی الی الخیر: میاں عبدالواحد
بھگوان سٹریٹ
پرانی انارکلی لاہور

ADARTS JOS-1/88

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیئور®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور
۲۲- لیاقت علی پارک ۴- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان
فون: ۲۲۱۵۹۸-۳۱۲۷۵۴

SV ADVERTISING

رفقاء و احباب نوٹ فرمالیں

اِمسال مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

سالانہ محاضراتِ قرآنی

اِن شاء اللہ العزیز لاہور میں ۲۴ تا ۲۸ مارچ ۸۹ء

اور

تنظیم اسلامی کا

چودھواں سالانہ اجتماع

لاہور ہی میں ۲۹ اور ۳۰ مارچ کو منعقد ہوگا

Jawad®
Products

We are manufacturing and exporting ready made garments (of all kinds including shirts, trousers, blouses, jackets, uniforms, hospital clothing; kitchen aprons), bedlinen, cotton bags, textile piece goods etc.

For further details write to :

M/s. Associated Industries (Garments) Pakistan (Private) Ltd.,
IV/C/3-A (Commercial Area),
Nazimabad,
Karachi - 18
Tele : 610220/616018/625594

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd. L. No. 7360
VOL. 38 No. 2
FEBRUARY 1989